ادب دوست

ماہنامہ

AUGUST 2007

مدیر اعلیٰ

سرورق
سلمان پرویز

بھارت سے آئے ہوئے ادبی ثقافتی تنظیم "ملاقات" کے سرپرست اعلیٰ ڈاکٹر ترن کمار کے اعزاز میں چیف ایڈیٹر ماہنامہ ادب دوست" اے جی جوش کی رہائش گاہ پر منعقدہ محفل شعرو سخن اور محفل موسیقی کے شرکار

(دائیں سے) ڈاکٹر ترن کمار، محمد امین، منی بھائی (ہوسٹن، امریکہ) اے جی جوش، ناصر زیدی شہزاد احمد

(دائیں سے) نوید قتیل، آغا شاہد، گلوکار حبیب علی، بشارت خان (پی ٹی وی) فرحت شہزاد

(دائیں سے) مسز فرحت شہزاد
مسز نوید قتیل، مسز آغا شاہد (فوزیہ ت

ماہنامہ لاہور

ادب دوست

جلد نمبر ۱۳ ● اگست ۲۰۰۷ء ● شمارہ نمبر ۸

رجسٹرڈ ایل نمبر 117

مدیر اعلیٰ

اے۔جی جوش

مدیر مسئول

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

سرورق

سلمان پرویز

تزئین

مقبول شرقپوری

پتہ برائے خط و کتابت

6-A-1 کپور تھلہ ہاؤس

لیک روڈ پرانی انارکلی لاہور

فون: 7241443

قیمت فی پرچہ 20 روپے ● سالانہ 200 روپے

ناشر اے۔جی جوش نے رحمٰن شمس پرنٹرز آبکاری روڈ لاہور سے چھپوا کر 39 کمرشل زون لبرٹی مارکیٹ گلبرگ III لاہور سے شائع کیا۔ فون: 5763143

اس شمارے میں

اداریہ

قارئین کرام! یوم آزادی مبارک

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ قوم کو جشن آزادی کی خوشیاں بہ اندازِ دگر نصیب ہوئیں۔ عدلیہ کی جرات اور وکلاء کی ہمت کو سلام کہ اس نے پہلی بار قوم کو حقیقی آزادی کے ذائقے سے آشنا کیا۔ جس کے نتیجے میں میڈیا کا بھی حوصلہ بلند ہوا۔ سیاستدانوں نے جدوجہد اور صاف گوئی کی راہ کو اپنایا اور قوم کو شفاف فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔

یہاں ارباب حکومت کی دانش اور ظرف کو خراج پیش کرنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے غیر دانشمندانہ اقدامات کو تسلیم کیا اور ان کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ معاملات کو مزید الجھانے کی بجائے سلجھانے کی راہ پر گامزن کیا۔ خدائے برتر و بالا وطن عزیز کے تمام طبقات کو عقل و دانش سے کام لینے کی توفیق ارزانی کرے۔ اس مرحلے پر اہل قلم پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنی خوابیدہ روش کو ترک کر کے حق گوئی اور جدوجہد کی راہ اپنائیں اہل سیاست کی رہنمائی کریں اور اپنے قلم کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں چراغ جلانے اور قوم کو روشنیاں عطا کرنے کا عزم کریں تا کہ اس ملک کو قائداعظم اور علامہ اقبال کے خوابوں کی سچی تعبیر میں ڈھالا جا سکے۔ جس کے انتظار میں ساٹھ سال گذر گئے۔

اے۔جی جوش

تعزیت نامہ

ممتاز شاعر، ادیب اور قانون دان ولایت حسین حیدری طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ مدیر ادب دوست اے جی جوش اور ادارے کے جملہ کارکن دعا دیتے ہیں کہ رب کریم مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

اے۔جی جوش

منیر سیفی

(ایک طویل حمد سے چند شعر)

حمد

شب کی بیداریوں میں بھی تو ہے
نیند سے یاریوں میں بھی تو ہے
دن میں شب میں نشانیاں تیری
چار سُو ہیں کہانیاں تیری!
تو پہاڑوں کو کیل دیتا ہے
تو ہوا سے خراج لیتا ہے
تو ہی ثابت، سفر میں بھی تو ہے
گھر سے باہر بھی، گھر میں بھی تو ہے
تو ہی قوس قزح کے جھولوں میں
تو ہی صحراؤں کے بگولوں میں
ریگ زاروں کا تو سراب بھی ہے
تیری مخلوق زیرِ آب بھی ہے
تو ہی اسباب بھی، علل بھی تو
تو پہیلی بھی اور حل بھی تو
تو ہی پانی فضا سے برسائے
تو ہی پانی پہ لوہا تیرائے
تو ہی بجلی گھروں کی جگمگ ہے
تو ہی کمپیوٹروں کی رگ رگ ہے
ایسا پہیہ بنا دیا تو نے
ایک چکر چلا دیا تو نے
آسماں بھی ترے، زمینیں بھی
آدمی بھی ترے مشینیں بھی
راز جتنے تھے تو نے بتلائے
علم جتنے تھے تو نے سکھلائے
تو ہی بگڑی سنوارنے والا
تو ہی بنی بگاڑنے والا

طاہر سعید ہارون

حمد

(دوہے)

تو داتا سنسار کا، رحمت کا تو بھور
جلوہ تیرا چار سُو، تو ہے بہتا نور

تو ساگر بے انت ہے میں ہوں ایک حباب
تجھ میں اک ٹھہراؤ ہے میں ٹھہرا بے تاب

تو ان داتا ہے خدا، سب کا پالن ہار
جا چک آیا مانگنے لے کر آس ہزار

سنتا ہے آکاش پہ کوئلیا کی کوک
بھیدی سب کے حال کا جانے من کی ہوک

غافر بھی ستار بھی مولا بخشنہار
قادر بھی قہار بھی متکبر، جبار

کیسا کیسا روپ ہے مولا تیری شان
بوجھے وہی پہیلیاں اُتر جس کا گیان

اللہ سائیں خیر دے مولا سائیں خیر
سائیں سب کو پریت دے بھولیں سارے بیر

ذوقی مظفر نگری

نعت رسول اکرمؐ

جس طرف توحید کے سورج کا سیارہ گیا
لات و عزیٰ کی حکومت کا فسوں گہنا گیا
خیر سے خیر البشر جب عالمِ بالا گیا
نور تھا، تاریکیوں کو نور پہناتا گیا
فرش سے بن ٹھن کے جس دم عرش کا دولہا گیا
نبضِ عالم رک گئی، ہر شے پہ سکتہ چھا گیا
جشنِ معراجِ محمدؐ جب ہوا ہے عرش پر
ان کے سر پر تاجِ ختم الانبیاء رکھا گیا
وہ سراپا بن گیا ہے معنیٔ صلِ علیٰ
جو مقدر سے دبستانِ نبیؐ میں آ گیا
تشنگی کوہِ ابی طالب میں جب لہرا گئی
پتھروں میں پانی کہتا ہوا دریا گیا
رحمتِ عالم نے جب طائف میں چھڑکا ہے لہو
گلشنِ اسلام آیا، کفر کا صحرا گیا
مشفقِ انساں گئے ہیں جب اسیروں کی طرف
قہر کی زنجیر ٹوٹی، جبر کا پہرا گیا
لامکاں کی رحمتیں اس کی محافظ ہو گئیں
''جو پناہِ سیدِ کون و مکاں میں آ گیا''
اس طرح سوچوں میں آئے مدحِ آقاؐ کے حروف
ذہن میں جیسے جمالِ مصطفیٰؐ آیا گیا
کاشفِ حق نے کہا جب ''قل ھو اللہ احد''
ہر صنم گر انقلابِ وقت سے گھبرا گیا
ذرے ذرے میں ضیا بھر دی مہ و خورشید کی
باتوں باتوں میں رموزِ زندگی سمجھا گیا
کفر کے سلطاں ہوئے ہیں سرورِ دیں کے غلام
جب کہیں کوئی سفیرِ داعیٔ بطحا گیا
جان دے دی جس نے جانِ خالقِ کونین پر
وہ فنا ہو کر بقائے جاودانی پا گیا
ظلمتوں کی کھیتوں سے روشنی اگنے لگی
رات کے جنگل میں جس دم نور کا دریا گیا
فرش پر ذوقیؔ مجھے آئی ہے بخشش کی نوید
عرش پر جس دم مری نعتوں کا طیارہ گیا

حسن عسکری کاظمی

نعت

آقاؐ مری تقدیر میں ایسی بھی گھڑی ہو
سر آپؐ کے قدموں پہ ہو اور موت کھڑی ہو

آئیں گے نکیرین مری قبر میں جس دم
زنجیرِ غلامی مرے ہاتھوں میں پڑی ہو

جب آپؐ سفارش کو مری آئیں گے مولاؐ
اس وقت فرشتوں سے مری آنکھ لڑی ہو

بخشیں مجھے پروانہ شفاعت کا تو اس دم
آنکھوں سے برستی ہوئی اشکوں کی جھڑی ہو

امت کے کسی فرد کو کیا فکر ہو آقاؐ!
جب رحمتِ سرکار گناہوں سے بڑی ہو

فریاد کہ میں نرغۂ اعدا میں گھرا ہوں
لگتا ہے کہ سینے میں کوئی کیل گڑی ہو

سر پہ ہو مرے سایۂ دامانِ محمدؐ!
جب حشر میں ہر سمت حسنؔ دھوپ کڑی ہو

محمد عبداللہ جمال

نعت

تری یادوں کے یہ جو قافلے ہیں
مٹا دیتے ہیں جتنے فاصلے ہیں

رہائی زلفوں سے میں تو نہ مانگوں
مری آزادی کے یہ سلسلے ہیں

ہوئے نہ خواب گو پورے کبھی بھی
میں دیکھوں خواب میرے حوصلے ہیں

مری آنکھوں میں جھانکو اور دیکھو
کہ ان میں رتجگے کتنے بسے ہیں

فراق یار ہی اب زندگی ہے
اسی سے وصل کے منظر سجے ہیں

بہاروں میں ملے ہیں زخم جتنے
رفو کرنے سے بھی یہ کب سلے ہیں

جمال یار کا اعجاز دیکھیں
اندھیرے خود اجالے بانٹتے ہیں

غیاث الدین غیاث

نعت

یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبی
سیّدی سیّدی سیّدی سیّدی

آمد مصطفیٰؐ سے ہوئی دہر میں
روشنی روشنی روشنی روشنی

آپ آئے تو رقصاں ہوئی ہر طرف
سرخوشی سرخوشی سرخوشی سرخوشی

بخش دی ایک نظر کرم سے ہمیں
آگہی آگہی آگہی آگہی

آپ کے ہر عمل نے سکھائی ہمیں
بندگی بندگی بندگی بندگی

آمد نور سے پشیماں بہت
تیرگی تیرگی تیرگی تیرگی

آپ کے آنے سے مل گئی ہے ہمیں
زندگی زندگی زندگی زندگی

انؐ کے ہر قول میں انؐ کے ہر فعل میں
سادگی سادگی سادگی سادگی

مصحف رخ سے چھانے لگی چار سو
دلکشی دلکشی دلکشی دلکشی

جام کوثر سے بجھتی ہے برحق غیاثؔ
تشنگی تشنگی تشنگی تشنگی

واجد امیر

نعت

جو نظر انداز تھے ان کو پذیرائی ملی
ذکر کیا پھولوں کا خاروں کو بھی رعنائی ملی

کیا انہیں معلوم جو طائف میں گذری آپؐ پر
دولت ایمان جن لوگوں کو ہاتھ آئی ملی

خاک میں تو نے ملائے سب فصاحت کے غرور
گنگ صدیوں کو ترے لہجے سے گویائی ملی

تو نے سب معیار بدلے وقت کی تقسیم کے
نام گمنامی کو اور شہرت کو رسوائی ملی

تو نے لب رکھے تو ٹھہرا بوسہ گاہ عاشقاں
سنگ اسود کو تری نسبت سے زیبائی ملی

نعت کہنے کا قرینہ بھی اسی در سے ملا
جس در اقدس سے مجھ کو خامہ فرسائی ملی

شہر دل آباد رہتا ہے نبیؐ کے ذکر سے
خلوتوں میں بھی واجدؔ بزم آرائی ملی

جاوید قیصرؔ

نعت

ذکر خیر الانام آیا ہے
خوشبوؤں کا پیام لایا ہے

منتظر کب سے ہوں بلاوے کا
ہجر نے تو بہت رلایا ہے

چھٹ ہی جائے گی تیرگی غم کی
کوئی کہدے تجھے بلایا ہے

امت مصطفےٰؐ میں شامل ہیں
ہم نے انعام خوب پایا ہے

درد و غم کیسے پاس ٹھہریں گے
آپ کو حال دل سنایا ہے

جو بھی ہے کائنات میں اس پر
آپ کی رحمتوں کا سایہ ہے

آپ کے ذکر میں اماں پائی
مجھ کو دنیا نے جب ستایا ہے

سب کو پالا ہے ان کی رحمت نے
کوئی اپنا ہے یا پرایا ہے

روح تک جھومنے لگی قیصرؔ
نام کس کا لبوں پہ آیا ہے

جمیل یوسف، مری

☆

یہ اک ذرہ جو چمکا ہے ستارہ ہو بھی سکتا ہے
ہمارے روز روشن کا اشارہ ہو بھی سکتا ہے

یہ ممکن ہے ہمیں موج بلا کے پار لے جائے
یہ اک طوفاں جو اٹھا ہے کنارہ ہو بھی سکتا ہے

عجب کیا ڈوبنے والے کنارے پر پہنچ جائیں
جسے تنکا سمجھتے ہیں سہارا ہو بھی سکتا ہے

کبھی ہم نے جو سب کو ورطہ حیرت میں ڈالا تھا
وہی اک معجزہ اب کے دوبارہ ہو بھی سکتا ہے

وہ منظر روشنی کا جو شب ظلمت سے ابھرا تھا
جبین وقت سے پھر آشکارا ہو بھی سکتا ہے

چمک کر اک کرن نے راستہ ہم کو دکھایا تھا
ہمارا سامنا اس سے دوبارہ ہو بھی سکتا ہے

وہ اک خواب حسیں جو جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا
اگر ہم جاگ اٹھیں تو ہمارا ہو بھی سکتا ہے

پروفیسر افتخار حسین وارث

غزل

اب تو اس درد کا اظہار نہیں ہو سکتا
ضبط کا حکم ہے انکار نہیں ہو سکتا

کوششیں رنگ تو لاتی ہیں یہ سچ ہے لیکن
کوششوں سے تو مگر پیار نہیں ہو سکتا

جب کہا جائے کہ چل اور وہ پوچھے کہ کہاں
وہ سبھی کچھ ہو مگر یار نہیں ہو سکتا

بیچ ڈالو کسی ویرانے میں جا کر مجھ کو
میرا سودا سربازار نہیں ہو سکتا

چاند تسخیر ہوا پھر بھی مگر چاند رہا
پھول تو پھول ہے اور خار نہیں ہو سکتا

میں تو تصویر ہوا میں بھی بنا سکتا ہوں
پر کسی غیر کو دیدار نہیں ہو سکتا

میں نے وارث کو کہا بھول ہی جاؤ اس کو
اور وارث نے کہا یار نہیں ہو سکتا

حسن عسکری کاظمی

☆

ستم شعار بنا وہ تو آسماں کی طرح
میں بے خبر ہی رہا طفل بے زباں کی طرح

اگرچہ دھوپ کڑی تھی مگر وہ دور رہا
ہوا نہ سایہ فگن مجھ پہ سائباں کی طرح

اسے یہ ضد کہ سنے نغمہ نشاط مگر
میں غم کی بات سناتا ہوں نوحہ خواں کی طرح

یہ فرض کب ہے کہ ہر شخص اس کا بن کے رہے
بنے جو اس کا وہ جھکتا رہے کماں کی طرح

سمٹ کے صورت نقطہ بنا لکیروں سے
وہ ایک لفظ جو پھیلا تھا داستاں کی طرح

مجھے تو کوئی بھی کھٹکا نہ تھا مگر پھر بھی
تمام رات نہ سویا میں پاسباں کی طرح

جو میرے گھر میں حسنؔ پھینکتے رہے پتھر
پڑے ہیں پاؤں مرے سنگ آستاں کی طرح

سید صفدر حسین جعفری، ایبٹ آباد

☆

منزلوں کو حیرتوں کے درمیاں رکھا گیا
پتھروں پر نقش پائے رہرواں رکھا گیا

منظروں نے کر دیئے مجھ پر عیاں اوراق حسن
اور مصور میری آنکھوں سے نہاں رکھا گیا

قید و بند عشق میں کیا ہم پہ گزری کیا کہیں
ہم کہاں رکھے گئے اور وہ کہاں رکھا گیا

کہ و مہ کے سامنے کیا کھولتے ہم حال دل
آنسوؤں کا آنکھ کے اندر مکاں رکھا گیا

مصرعہ تر کا رچاؤ ہائے وہ منظر کشی
اور غزل خواں میری آنکھوں سے نہاں رکھا گیا

میں کہیں بچ کر نکل جاؤں نہ دشت شوق سے
مجھ کو صفدرؔ جعفری آتش بجاں رکھا گیا

ولایت حسین حیدری

☆

قرآن کو محتاج تصوف مت کر
ارشادِ پیمبرؐ میں تصرف مت کر

منزل کی لگن جان کا صدقہ مانگے
گر جائے ہمالہ بھی اگر اف مت کر

ہر موڑ پہ خوش رنگ نظارے ہوں گے
رستے میں کسی طور توقف مت کر

جب پھول کھلے جشن منایا نہ گیا
اب باغ اجڑنے پہ تاسف مت کر

دن رات مروت کے تبر لگتے ہیں
سکھ چین اگر چاہے تکلف مت کر

جس شخص کو ہو حیدری تخریب پسند
اس شخص سے تو اپنا تعارف مت کر

٭ (ولایت حسین حیدری (مرحوم) کی ارسال کردہ آخری غزل)

احمد صغیر صدیقی

☆

اپنے گھر کی چھت پر تھا
دل اک نیک کبوتر تھا

پودے سارے نقلی تھے
کھیت ہمارا بنجر تھا

سب کچھ ٹھیک بتاتے تھے
حال کچھ اتنا ابتر تھا

سنتا کون سمجھتا کون
شور شغب سب اندر تھا

ڈوب گئے انجانے میں
گہرا سوچ سمندر تھا

کنول فیروز

☆

گلی گلی میں ملیں گی روایتیں میری
زمانہ یاد کرے گا محبتیں میری

تری نگاہ کرم کی ہیں آج بھی محتاج
وہ مست مست فضائیں و ساعتیں میری

میں رند مست ہوں لیکن رفیق ہوں اس کا
فقیہ شہر سے پوچھو شرافتیں میری

ترا نظام عدل تیری نیتوں کا دکیل
وہ جس پہ طنز کناں ہیں صداقتیں میری

یہ ترے واسطے آساں ہے مجھ کو مشکل ہے
ترے وصال کی خواہاں ہیں چاہتیں میری

خیال و فکر میں روشن ہیں مشعلوں کی طرح
کسی کے لمس سے مہکیں رفاقتیں میری

تمام عمر کیا تو نے پیار سے سرشار
وہ تو ہے جس نے بگاڑی ہیں عادتیں میری

کنولؔ وہ دام وفا سے نکل گیا آخر
کسی بھی کام نہ آئیں سیاستیں میری

☆

کرشن پرویز، بھارت

☆

کھلائے لیڈروں نے اس طرح سے گل سیاست کے
کہ ہر سُو لہلہاتے پھول پودے اب تو نفرت کے

کہیں مندر کہیں مسجد کہیں کرسی کا جھگڑا ہے
ڈرامے ہر طرف ہی ہو رہے کتنے سیاست کے

جسے دیکھا یہاں ہم نے وہی طالب ہے کرسی کا
یہاں نااہل بھی کرتے ہیں ولولے اب قیادت کے

ہزاروں جرم کر کے بھی پھریں اجلے لباسوں میں
کرشمے ہیں سیاست کے، وکیلوں کے، عدالت کے

وطن کے مجرموں کی فائلیں زر سے دبا ڈالیں
کہ برسوں اٹھ نہیں پاتے یہاں پردے حقیقت کے

چمن کے پاسبانو تم ذرا اپنی روش بدلو
کہیں پرویزؔ پھر بھڑکیں یہاں شعلے بغاوت کے

☆

افضال شاہد

☆

کسی کو در کی خبر ہے نہ اپنے بام کی ہے
نگر یہ کس کا ہے، بستی یہ کس کے نام کی ہے

کچھ اپنے ظرف سے بڑھ کر میں مانگتا کب ہوں
مری تو پیاس فقط ایک آدھ جام کی ہے

گذر ہی جاتا ہے یہ دن کئی بہانوں سے
ہے مجھ کو ایک ہی الجھن جو عصر شام کی ہے

برستی رہتی ہے برسات آنسوؤں کی جہاں
یہ قبر لگتا ہے مجھ ایسے تشنہ کام کی ہے

بدلنا اب نہ ارادہ سفر کا تم یارو!
کہ اب تو ساری مسافت ہی ایک گام کی ہے

یہ لوگ میرے وطن کے بڑے ہی بھولے ہیں
نہ کوئی جال کی حاجت نہ ان کو دام کی ہے

نہ کوئی ٹکڑوں میں تقسیم اس کو اب کرنا
زمیں یہ میرے خدا کی ہے تیرے رام کی ہے

غم حسینؑ بہت ہے میرے لئے شاہد
مرے اثاثے میں بس ایک چیز کام کی ہے

کرامت بخاری

☆

قریہ معرفت جہاں تک ہے
منزل عشق بھی وہاں تک ہے

صوت کا سلسلہ سماعت تک
بات کا ذائقہ زباں تک ہے

زیست کی بیکراں مسافت بھی
چند لفظوں کی داستاں تک ہے

اک خسارہ ہے کاروبار حیات
سود کو واسطہ زیاں تک ہے

دل کی دیوانگی یہ پوچھتی ہے
ہوش کی سلطنت کہاں تک ہے

لوٹ آئے گا وہ کبھی نہ کبھی
ہر یقیں بھی میرا گماں تک ہے

میں کہ خائف نہیں ہوں خطروں سے
یہ تصور تو جسم و جاں تک ہے

قاضی اعجاز محور (گوجرانوالہ)

☆

آنکھ بے وجہ اپنی روئی نہیں
تیرا نعم البدل ہی کوئی نہیں

دن تجھے کس گلی میں چھوڑ آیا
رات روئی ہے اتنا سوئی نہیں

منتظر ہوں وہ فصل پک جائے
جو ابھی خواہشوں نے بوئی نہیں

یونہی خاموش ہو گئے سب ہی
بات اب کرنے والا کوئی نہیں

بے زباں چیختا ہوں بستی میں
دیکھتے سب ہیں سنتا کوئی نہیں

آج میں کس سفر پہ نکلا ہوں
الوداع کہنے والا کوئی نہیں

سانس لینا ہے خودکشی محور
زندگی دینے والا کوئی نہیں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

☆

وہ لاکھ ہے دنیا سے حسیں تر اسے کہنا
اب کچھ بھی نہیں دل سے اتر کر اسے کہنا

خوابوں کو خرد مند بھلا دیتے ہیں اکثر
وہ بھی تھا کسی خواب کا منظر اسے کہنا

دریا کبھی دل والوں کے دشمن نہیں ہوتے
وہ ہی تھا سرابوں کا شناور اسے کہنا

قدرت کسی مغرور کو پھلنے نہیں دیتی
اچھے نہیں حالات کے تیور اسے کہنا

انساں تو کوئی حشر بپا کر نہیں سکتا
وہ لاکھ اٹھا سکتا ہو محشر اسے کہنا

وہ چھوڑ دے اب راہ کو تکنا میری ورنہ
ہو جائے گا اک روز وہ پتھر اسے کہنا

حالات بنا دیتے ہیں ہر شخص کو شاطر
سعدی تھا کبھی مرا قلندر اسے کہنا

عارف شفیق

☆

جنم دے کر جو مجھ کو مر گئی تھی
مری ماں اب بھی مجھ میں پل رہی تھی

بہت گہری زمیں کھودی گئی تھی
مگر بنیاد پھر بھی کھوکھلی تھی

ہوا کی بے رخی ایسی چلی تھی
تری تصویر بھی الٹی پڑی تھی

گرا اک وہم مجھ پر بجلی بن کر
کہ چڑیا تار پر بیٹھی ہوئی تھی

مہکتے تھے جہاں پر پھول چہرے
وہاں بارود کی بو کیوں بسی تھی

کھرچ کر وقت نے وہ پھینک دی سب
بدن میں اس کے جتنی چاندنی تھی

وہاں رہبر نے لا کر ہم کو چھوڑا
جہاں اب سامنے بند اک گلی تھی

بجھایا تھا مجھے اس نے ہی عارفؔ
جو آندھی میرے اندر سے اٹھی تھی

غیاث الدین غیاثؔ

☆

دل عجب شہر ہے نادانوں کا
ہے بسیرا یہاں دیوانوں کا

اب حقیقت سے شناسائی ہے
ذکر اب کیا کریں افسانوں کا

جان دیتے ہیں وفا میں ہر دم
ایک ہی جرم ہے پروانوں کا

خود ہی سا[illegible]ی لے آتے ہیں
کیا عجب [illegible] ہے طوفانوں کا

فکر و ادراک کا پہرہ رکھو
کچھ بھروسہ نہیں ارمانوں کا

دوستی کو تو پرندے ہی بھلے
حال دیکھا نہیں انسانوں کا

ناچتے خود تو نہیں ہیں غیاثؔ
رقص میں شوق ہے مستانوں کا

صابر عظیم آبادی

☆

نقاب رخ سے اٹھا کر وہ جب گرائے گا
تمام شہر اندھیرے میں ڈوب جائے گا

عداوتوں کا گھنا پیڑ ہی اگائے گا
وہ بے وفا ہے کہاں دوستی نبھائے گا

یہ خوں اگلتی ہوئی ساعتیں بتاتی ہیں
کوئی کسی کے لئے دکھ نہیں اٹھائے گا

بہت دنوں سے دھوئیں کی لپیٹ میں ہے شجر
تُو اپنا آشیاں کس شاخ پر بنائے گا

تجھے ڈبو نہ کہیں دے یہ تیری خوش فہمی
وہ آزمائے ہوئے کو بھی آزمائے گا

کسی بھی طور ہم اس کو بھلا نہیں سکتے
وہ یادگار زمانہ ہے یاد آئے گا

یہاں کے لوگ تو ظلمت پرست ہیں صابرؔ
چراغ کون سر راہ میں جلائے گا

اسلم شاہد

☆

پہلے تو اس زمیں پہ اتارا گیا مجھے
پھر سات آسماں سے پکارا گیا مجھے

میرا لہو بھی میرے مخالف کے ساتھ تھا
میرے ہی تیر سے یہاں مارا گیا مجھے

دنیا کا کھیل تھا میں سبھی کھیلتے رہے
جیتا گیا مجھے، کبھی ہارا گیا مجھے

میں کس طرح فساد کو دھرتی میں بیج دوں
جس کا لہو پلا کے سنوارا گیا مجھے

کشتی کو بادباں سے سنبھالا نہیں گیا
دریا میں ساتھ لے کے کنارا گیا مجھے

آئی ہوئی بہار کو آنکھوں سے دیکھ لے
جلتے ہوئے چمن سے پکارا گیا مجھے

زندہ تھی جس کے پیار سے قاتل کی آبرو
مقتل میں اس کے نام پہ وارا گیا مجھے

ظریف احسن

☆

میرے اطراف میں جو تماشا ہے
کیا تمہاری سمجھ میں آتا ہے

شہر آباد رونقیں آباد
دل کی دھڑکن کو کون سنتا ہے

میں وہ آئینہ روبرو جس کے
یہ جہاں دیر تک سنورتا ہے

تری یادوں کے دیپ جلتے ہیں
اور کوئی آنکھ کو بھگوتا ہے

رائیگانی کا کیوں ملال نہ ہو
پاس رہ کر وہ دور ہوتا ہے

سر سے پا تک میں جس میں بھیگ سکوں
اب وہ ساون کہاں برستا ہے

رفیع یوسفی محرم

☆

خواب مٹی ہو گئے تعبیر مٹی ہو گئی
علم و فن کے شہر کی تعمیر مٹی ہو گئی
چاہتوں کے سارے موسم پیلی سرسوں ہو گئے
خوشنما رنگوں کی ہر تصویر مٹی ہو گئی
وہ کہانی وہ فسانے وقت کے سیلاب میں
نقش سارے مٹ گئے تحریر مٹی ہو گئی
دوستوں کی بے رخی کا اب نہیں کوئی ملال
دوستی کے باب کی تفسیر مٹی ہو گئی!
اب جواہر کیوں سجائیں شہر کے بازار میں
موتیوں کی شہر میں توقیر مٹی ہو گئی
ایک ہم ہیں ہاتھ میں سونا بھی اپنے ریت ہے
ایک وہ ہیں ہاتھ میں اکسیر مٹی ہو گئی!
روشنی کے شہر میں اندھیر ہی اندھیر ہے
جگمگاتی تھی کبھی تنویر مٹی ہو گئی
راہنما رہزن بنے ہیں کارواں کو لوٹ کر
بے اثر واعظ ہوا تقریر مٹی ہو گئی
خوشبوؤں کے دیس میں اب اک مکاں کی آرزو
خواہشوں کے محل کی تعمیر مٹی ہو گئی
عاشقی کے کھیل میں بس لے لیا رانجھے نے جوگ
عشق میں رانجھے کے محرم ہیر مٹی ہو گئی

نوید سروش

☆

بستی بستی کھویا رستا
جگنو جگنو چمکا رستا

تنہا تنہا دیکھ کے مجھ کو
صحرا صحرا رویا رستا

جنگل، بارش کھلیانوں میں
کیسے کیسے بکھرا رستا

منزل کو پانا مشکل ہے
دیتا ہو جب دھوکا رستا

ہم تو رستا کھو بیٹھے تھے
تم نے پھر دکھلایا رستا

جس رستے سے تم گزرے ہو
خوشبو خوشبو مہکا رستا

آنکھیں پتھر ہو جاتی ہیں
تکتے تکتے تیرا رستا

اے جی جوش

☆

کیسے نکلتے اپنے گھر سے
چھپے رہے قاتل کے ڈر سے

ڈوبنے کا احساس ہوا تب
سیلِ رواں جب گزرا سر سے

کھو بیٹھے ہم منزل اپنی
اب کیا حاصل عزمِ سفر سے

سرخ لگا ہے تاج محل بھی
خون جو ٹپکا چشمِ تر سے

کس پہ کرو گے ظلم و ستم اب
ہم تو رخصت ہوئے نگر سے

دل کی حالت جوشؔ نہ پوچھو
اس نے جو دیکھا مست نظر سے

نسیم عباس احمر

ڈاکٹر خورشید رضوی......بحیثیت خاکہ نگار

خاکہ نگاری اردو نثر کی جدید اصناف میں ایک وقیع اور تبحر اضافہ ہے۔ اس صنف سخن میں باقاعدہ اور باضابطہ طبع آزمائی کا سہرا مرزا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے۔ جنہوں نے اس کے ابتدائی رموز متشکل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خاکہ نگاری ایسی صنف ہے جس میں ایک مرکزی شخصیت، موضوع سخن ہوتی ہے۔ خاکہ نگار کے لئے پرتاثیر اور دلچسپ خاکہ نگاری چند باتوں سے مشروط ہے۔ اولاً خاکہ نگار کے ساتھ موضوع شخصیت کا گہرے یا سطحی مراسم کا ہونا۔ ثانیاً خاکہ نگار کے لیے مشاہدہ کی گہرائی کا ہونا۔ ثالثاً موضوع شخصیت کے روشن و تاریک پہلوؤں کا بیان کیونکہ شخصیت کی تکمیل ہر ضد کے کامل ہونے سے عبارت ہے۔ خاکہ نگاری کی جامع تعریف ڈاکٹر بشیر سیفی یوں کرتے ہیں:

''خاکہ ایسا تخلیقی مضمون ہے جس میں کسی فرد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو ذاتی حوالے سے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔'' (خاکہ نگاری از ڈاکٹر بشیر سیفی، ص ۱۷، ۱۹۹۳ء)

فرحت اللہ بیگ کے شگفتہ اظہار کے بعد رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، محمد طفیل اور احمد بشیر کے نام ممتاز خاکہ نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ مذکورہ تمام خاکہ نگاروں نے اپنے مخصوص اسلوب کے حامل خاکے تخلیق کیے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا مجموعہ مضامین ''تالیف'' سات خاکوں پر مشتمل ہے۔ موضوع شخصیات، علمی و ادبی شخصیات ہیں اور ان میں سے اکثریت کے ساتھ خورشید رضوی کا دوستانہ تعلق تھا، کچھ میں احترام کا رشتہ تھا لیکن ڈاکٹر خورشید رضوی نے موضوع شخصیات کا بے لاگ خاکہ کھینچا ہے جو کہ ان کے خاکہ نگاری کی صنف کی فنی دروبست سے آگاہی کا بین ثبوت ہے۔

کردار نگاری یا سیرت کشی، خاکہ نگاری کی اہم اور مقدم خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کی خاکہ نگاری میں یہ خوبی اپنے اوج کمال کو پہنچی ہوئی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ تمام خاکہ سیرت کشی کا نمونہ ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سیرت کشی کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید رضوی خوبیوں کو روانی سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں جبکہ خامیوں کی طرف اشاروں میں بات کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی اپنی شخصیت کی منکسر المزاجی ہے۔

سیرت کشی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''وہ یکا یک ایک سادہ سا دل، بے ضرر، معصوم اور حال مست قلندر کی حیثیت سے سامنے آ گیا جس سے

محبت کرنے پر میں نے خود کو مجبور پایا۔" (انور مسعود' تالیف' ص ۱۷)

"معاملات کی صفائی میں آئینہ کردار ہیں۔ پنسل کا ایک ٹکڑا بھی کسی کا اگر ان کے پاس رہ جائے تو چل کر جائیں گے اور اسے دے کر آئیں گے کسی سے کچھ مانگنا ان کی طبیعت سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا۔"

(پیر صاحب' تالیف' ص ۷۳)

"نحیف و نزار' مشت استخواں سی یہ شخصیت جسے کسی نے "اصغر" کی رعایت سے "اسم با مجسم" کہا تھا۔ داخلی طور پر ایک کائنات اصغر ہے۔ لیکن مجھے اس کے پھیلاؤ سے زیادہ اس کے سمٹاؤ سے دل چسپی رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لوگوں کو دل سے چاہنے کا درس حاصل کر لینے کے باوجود جیلانی صاحب کے دل سے چاہنے کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔" (جیلانی صاحب' تالیف' ص ۳۳)

خاکہ نگاری میں حلیہ نگاری کا بھی اپنا مقام ہے۔ حلیہ نگاری سے خارج سے باطن میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔

"رنگت گندمی' سینہ چوڑا' سفید ریش' قد درازی میں انگشت نما' چہرہ جو پرانی تصویروں میں پر گوشت ہے۔ اب استخوانیت کی طرف مائل تھا۔ اونچی دیوار کی ٹوپی پہنے وہ مجھے مرزا غالب سے مشابہ نظر آئے۔"

(علامہ عبدالعزیز میمن' تالیف' ص ۵۴)

خاکہ ایجاز و اختصار کا نمونہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے خاکوں کی بھی یہی خوبی توجہ طلب ہے کہ ان کے خاکے ایجاز و اختصار کا اعجاز ہیں۔

"انور کی لفظیات صوتیات'، نغمگی کا نظام' بحور و اوزان اور مضامین بیشتر اس کے اپنے ہیں' انور' بالیقین اپنی طرز کا موجد اور شاید خاتم بھی۔" (انور مسعود' تالیف' ص ۱۸)

"الروض الانف کے نام سے یاد آ گیا کہ وہ اس کتاب کے بڑے مداح تھے ایک روز اپنے خاص ستائشی اسلوب میں فرمایا۔ بھئی سیرت کے باب میں یہ آسمانی کتاب ہے اور نحو کے باب میں سیبویہ کی کتاب آسمانی ہے۔" (علامہ عبدالعزیز میمن' تالیف' ص ۶۲)

شگفتگی کا عنصر خاکہ نگاری میں شامل ہو گیا ہے۔ اس روایت میں ڈاکٹر خورشید رضوی کا اسلوب خاکہ نگاری میں شگفتگی بھر آئی ہے۔

"ایک بار کسی دوست نے اس سے کہا تھا۔ یار انور اک دوائی کڈھیں۔ میں دوائی لینی آ۔ مینوں ریشہ بوہت پے گیا اے۔" انور نے برجستہ کہا "لے پھڑ یار اک تے تیری ریشہ دوانیاں نے مار لیا اے۔"

(انور مسعود' تالیف' ص ۲۰)

''جیلانی صاحب عالم آدمی ہیں۔لیکن انہیں فاضل نہ کہیے۔زندگی کے تمام فاضل عناصر سے انہیں ذہنی بُعد ہے۔''(جیلانی صاحب' تالیف' ص ۲۹)

خاکہ نگاری میں واقعات سے شخصیت کی عکاسی کی جاتی ہے اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ابھارا جاتا ہے۔خورشید رضوی کی خاکہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع شخصیت کے ادبی و علمی کام کا محققانہ و ناقدانہ تجزیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے ان کی علمیت کے اجاگر ہونے کے ساتھ شخصیت کی علمیت اور ذوق تبحر علمی آشکار ہوتی ہے۔

''پیر صاحب نے ''للنبض'' لکھ کر الازہری کی تہذیب اللغتہ جلد دو کے صفحہ ۱۶۱ کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ للنبض کی جگہ النبض پڑھنے سے مفہوم کس قدر مبہوم تھا۔ یہ تحقیق متن کی فرو گزاشت ہے۔(پیر صاحب' تالیف' ص ۷۵)

روانی سلاست' ڈاکٹر خورشید رضوی کی خاکہ نگاری کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔رواں بیان ملاحظہ ہے:

''مجھ سے پوچھا جائے کہ میں نے سب سے زیادہ براق brilliant ذہن کس کا دیکھا تو میں کہوں گا غلام جیلانی اصغر کا۔جیلانی صاحب کے اس براق ذہن کی ہم زادان کی نفوذ کر جانے والی آنکھ ہے۔جو ہمدرد فاؤنڈیشن والوں کی دل چسپی اصطلاح کے مطابق --عکس ریز'' x-rays کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔وہ چیزوں کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔''(جیلانی صاحب' تالیف' ص ۶۳)

شخصیت کے محل وقوع کی مرقع نگاری کرتے وقت ڈاکٹر خورشید رضوی' معاشرتی صورت حال پر بھی اشارتاً بات کرتے چلے جاتے ہیں۔

''مکان برا نہ تھا۔لیکن یہاں بسا اوقات بارش کا پانی دروازے پر کئی کئی دن دست بستہ کھڑا رہتا تھا اور بالآخر کیچڑ کا روپ دھار کر رفتہ رفتہ پیوند زمین ہو جاتا تھا۔بالعموم ایسے حالات میں عظمت رفتہ کا کابوس آدمی کے حواس کو دبا لیتا ہے اور گفتگو لفظ کے بجائے آہ سرد کے حوالے سے ہونے لگتی ہے لیکن سہیل بخاری' سہیل یمانی کی طرح آب و گل کے اس کھیل سے بہت بلند اپنے افق پر آپ جگمگاتے رہے۔ان کی دھن میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔اور ان کی گفتگو کے شاخچوں میں لفظوں کے شگوفے اس طرح پھوٹتے رہے۔''(ڈاکٹر سہیل بخاری' تالیف' ص ۸۰)

لطائف و واقعات کے تذکروں سے خاکوں کی چاشنی کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

''ایک بار حاجی بشیر صاحب نے ایک تنقیدی نشست میں غزل پڑھی جس کی ردیف دریا تھی۔ایک شعر یوں تھا

تشنہ لب آئیں تشنہ لب جائیں

زندگی ہے فرات کا دریا

امجد صاحب کو اعتراض تھا کہ فرات کے دریا سے تشنہ لبی کی روایت دائمی ربط نہیں رکھتی۔ بلکہ صرف ایک المناک تاریخی سانحے سے وابستہ ہے۔ چنانچہ یہاں استعارہ کامل نہیں ہو سکا۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں حاجی صاحب کی جگہ ہوتا تو یوں کہتا:

تشنہ لب آئیں تشنہ لب جائیں
زندگی ہے سراب کا دریا
(مجید امجد' تالیف' ص ۵۱)

اشعار سے خاکوں کو مزین کرتے ہیں۔

''وہ خود سے خوش تھے اور خود میں مست۔ آئینے سے ان کی صلح تھی۔ یگانہ کا یہ شعر ان پر صادق آتا تھا۔

زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا
ہم اپنی دھن میں زمانے سے بے خبر گزرے''
(ڈاکٹر سہیل بخاری' تالیف' ص ۸۰)

عربی و فارسی محاورات کا استعمال بھی کر دیتے ہیں۔ جس سے ڈاکٹر خورشید رضوی کی عربی اور فارسی پر دسترس عیاں ہوتی ہے۔

''سامعین! پیر صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کی حکایت لذیذ تھی۔ لہٰذا کسی حد تک ''دراز تر گفتم'' کے ذیل میں جا پڑی۔'' (پیر صاحب' تالیف' ص ۷۸)

رعایت لفظی کا استعمال ڈاکٹر خورشید رضوی کے خاکوں میں کثرت سے ہوا ہے۔

''میں نے دیکھا کہ ان میں کم آمیزی کے ساتھ ساتھ دل آویزی بھی ہے۔'' (پیر صاحب' تالیف' ص ۷۰)

''جیلانی صاحب عالم آدمی ہیں۔ لیکن انہیں فاضل نہ کہیے۔ زندگی کے تمام فاضل عناصر سے انہیں ذہنی بُعد ہے۔'' (جیلانی صاحب' تالیف' ص ۲۹)

نادر تشبیہات کے نمونے ملاحظہ ہوں:

''یہ سب حوالے ان کی ذات کی دہلیز پر رکھے۔ یوں دکھائی دیتے ہیں کہ جیسے بزرگ کے آستانے پر اتری ہوئی جوتیاں۔'' (ڈاکٹر سہیل بخاری' تالیف' ص ۸۰)

ڈاکٹر خورشید رضوی کا اسلوب بیان' سادگی پرکاری کا عملی مظہر ہے۔ لیکن ڈاکٹر خورشید کی شاعرانہ نثر بار ہا اپنا ذائقہ متعارف

کرواتی ہے۔

''تو میرے ذہن میں معاً ایک کہنہ سال عینک کے سفید شیشوں کے پس منظر میں مجید امجد کی اپنی شبیہ ابھر آتی ہے۔ جس میں دور دیس سے آئے ہوئے ایک اجنبی ہنس کی سی خوفزدہ معصومیت کا تاثر ملتا تھا۔''

(مجید امجد' تالیف' ص ۴۴)

''ماضی گدلی جھیل کو ہلکورا دیتا ہوں تو جا بجا سنہرے بجرے جگ مگ کرنے لگتے ہیں۔'' (ڈاکٹر سہیل بخاری' تالیف' ص ۷۹)

صنعت تجنیس خطی کا استعمال ملاحظہ ہو:

''نہ وہ میرا فین ہے نہ میں اس کا فین ہوں۔ اس لیے کہ ہم تو ایک دوسرے کے عین ہیں۔'' (انور مسعود' تالیف' ص ۲۲)

بلاغت کا عنصر' ڈاکٹر خورشید رضوی کے عام ادبی و علمی مضامین کی طرح خاکوں میں بھی موجود ہے۔

''ان کی علیت جو پہلے شنیدہ کے ذیل میں آتی ہے ابدیدہ کے درجے تک پہنچ گئی۔'' (پیر صاحب' تالیف' ص ۶۹)

کچھ خاکوں کے آغاز ندرت خیال کی ذیل میں آتے ہیں۔

''دوستی وہ مقام ہے جہاں ترک تحفظات ممکن ہو۔ لیکن ہر طرح کی بے وقاری کے باوجود آدمی بے وقار نہ ہوتا ہو۔ انور مسعود کی ذات میرے لیے ایک ایسا ہی مقام ہے۔'' (انور مسعود' تالیف' ص ۱۶)

مندرجہ بالا' ڈاکٹر خورشید رضوی کی خاکہ نگاری کے جمالیاتی تجزیے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ خورشید رضوی نے موضوع شخصیات کے مکمل خاکے' کھینچ کے رکھ دیے ہیں۔ جن کی انفرادیت اپنا رنگ رس کشید کرتی ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

حضرت برق نوشاہی

سب سے پہلے تو میں ممنون ہوں کاروان ادب کے صدر جناب صابر رضا کا جنہوں نے مجھے پاکستان سے براستہ مانچسٹر امریکہ بلایا اور آج یہاں برمنگھم لے کر آئے ہیں۔ اس کے بعد ممنون ہوں جناب منصور آفاق کا جنہوں نے حضرت ابوالکمال برق نوشاہی صاحب کے حوالے سے منعقدہ اس کانفرنس میں آپ سے ہمکلام ہونے کا موقع فراہم کیا۔

حضرت برق نوشاہی صوفیاء کے جس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اس سلسلے کے بانی پنجابی کے نثری ادب کے بھی بانی پیر نوشہ قادری کے چھ مواعظ جو "مواعظ نوشہ پیر" کے نام سے معروف ہیں اور جن میں سے چھٹا وعظ ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد نے دریافت کیا تھا' ایم اے پنجابی کے نصاب کا لازمی حصہ ہیں۔ سو میرا اس سلسلہ صوفیاء سے اس وقت سے تعلق چلا آ رہا ہے جب ۱۹۷۸ء میں' میں نے ایم اے پنجابی کیا اور پھر یہ تعلق اس وقت مزید مستحکم ہوا جب میں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے "شعبہ پاکستانی زبانیں" کے چیئرمین کی حیثیت سے "ایم فل" کا نصاب مرتب کیا اور اس کے لئے ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد اور پروفیسر حمید اللہ ہاشمی سے نصاب لکھوایا۔ اور اب اسے اپنے طالب علموں کو پڑھا رہا ہوں۔

حضرت برق نوشاہی کے نام اور کام سے میں بخوبی واقف ہوں اور اسی سلسلے کے دو اور علمی نام جناب سید شرافت نوشاہی اور جناب عارف نوشاہی بھی میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ جناب برق سمیت اس سلسلے کے تمام بزرگوں نے پنجابی زبان و ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ سید شرافت نوشاہی کی تاریخ اور عارف نوشاہی کا مخطوطات کے حوالے سے کام گرانقدر اہمیت کا حامل ہے۔ جناب برق نوشاہی ایک صاحب حال صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال عالم اور صاحب طرز شاعر بھی تھے۔ ان کی دینی خدمات پر تو بہت سے لوگوں نے روشنی ڈالی ہے۔ میں صرف اپنے آپ کو ادب تک محدود رکھوں گا تا کہ مختصر وقت میں اپنی بات مکمل کر سکوں۔

جناب برق نوشاہی چار زبانوں کے عالم اور شاعر تھے۔ فارسی میں آپ کی نعتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ صرف دو شعر یہاں پڑھتا ہوں

ز نور مصطفیٰ ارض و سما پر نور ہے بینم
زمین پاک بطحا سجدہ گاہے طور ے بینم
امام الانبیاء محبوب خالق، ساقی کوثر
ثریا تا ثریٰ از عشق او مخمور ے بینم

اردو میں تفسیر، فقہ، تصوف، طب، منطق، صرف ونحو کے موضوعات پر مختلف کتب کے علاوہ آپ کو فن تاریخ گوئی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ آپ نے سفرنامے اور تنقید بھی لکھی۔

پنجابی میں آپ نے "چٹھیاں" یعنی منظوم خط لکھے۔ دو عدد باراں ماہ لکھے۔ سی حرفیاں لکھیں اور اس کے علاوہ جو کچھ لکھا اس میں سے بیشتر غیر مطبوعہ ہے۔ میں نے آپ کو جو مطبوعہ کلام پڑھا ہے اس میں موجود مضمون آفرینی کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ میری طرح ہر پڑھنے والے کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں معصومیت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

سید برق نوشاہی نے بے شمار کارنامے سرانجام دیئے ہیں جن میں سے ایک پیر نوشہ قادری کے مزار اقدس کی تعمیر نو بھی ہے۔ اس سلسلہ تعمیر وترقی کو تدوین وترتیب کے حوالے سے بھی جاری رہنا چاہیے۔

دنیا میں آدمی کی کچھ روحانی ضرورتیں ہوتی ہیں اور کچھ انسانی۔ برق صاحب اس سے بخوبی واقف تھے چنانچہ انہوں نے ایک قصہ بعنوان "جٹ تے ملاں" بھی تحریر کیا۔ حضرت برق صاحب کے ہاں طنز وتنقید کا جو گہرا شعور پایا جاتا ہے یہ قصہ اسی کا غماز ہے۔ نمونے کے طور پر اس میں سے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں جو ہم جیسے مزاح نگاروں کو ان کے مزید قریب لے جاتے ہیں

ملاں اور مجبوری

صبح شام دیاں روٹیاں لئے باجھوں بے نمازاں پڑھایئے تے کیہ کھایئے
پیسے لئے باجھوں وچ جلیبیاں دے جیکر وعظ سنایئے تے کیہ کھایئے
روز نویں توں نویں اسلام اندر جے نہ فتنے مچایئے تے کیہ کھایئے
بحث نور تے بشر دی چھیڑ کے تے جے نہ تیلیاں لایئے تے کیہ کھایئے
بگل مار کے وانگ منافقاں دے پیراں کول نہ جایئے تے کیہ کھایئے
سادہ لوح عوام نوں والا کے جے نہ راہواں بھلایئے تے کیہ کھایئے
نت درس قرآں حدیث دے کے مفت مغز کھپایئے تے کیہ کھایئے
برق ٹھوک نکاح، نکاح اتے جے نہ نکر کمایئے تے کیہ کھایئے

(برمنگھم میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)

شفیق انجم

ڈاکٹر رشید امجد --ایک مطالعہ

ڈاکٹر رشید امجد ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے وقت ان کا نام اختر رشید امجد رکھا گیا۔ ان کے والد غلام محی الدین مونس نقشی ایک درویش صفت اور منکسر المزاج انسان تھے۔ قالینوں کی نقش گری ان کا پیشہ تھا۔ کشمیری کے ساتھ ساتھ فارسی اور پنجابی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ فارسی اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ رشید امجد نے ابتدائی تعلیم سری نگر ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے راولپنڈی آئے اور محلہ نانک پورہ میں رہائش اختیار کی۔ موہن پورہ میں واقع پاکستان گرلز ہائی سکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان اور پھر ڈینیز ہائی سکول سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد کا دورانیہ رشید امجد کے لیے نہایت درجہ آزمائش لے کر آیا۔ مالی مشکلات کی بدولت تعلیمی تسلسل ٹوٹ گیا اور انہیں آلام روزگار نے آ گھیرا۔ طویل وقفے کے بعد انہوں نے ایف اے اور بی اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں گورڈن کالج سے ایم اے اردو کیا اور یکم نومبر ۱۹۶۸ء کو سی بی کالج واہ کینٹ میں لیکچرار اردو مقرر ہوئے۔ اسی سال ایف جی سر سید کالج راولپنڈی کینٹ میں تعینات ہوئے اور پھر یہیں سے پروفیسر و صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ۲۰۰۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ جولائی ۲۰۰۱ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد سے بطور وزٹنگ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو وابستہ ہوئے اور تاحال اسی منصب پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر رشید امجد کی زندگی انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد کا ایک پُرمعنی استعارہ ہے۔ ایک بنجر نقطے سے آغاز کر کے انہوں نے اپنے آپ کو جس مقام پر لا کھڑا کیا وہ نہایت ارفع و اعلیٰ ہی نہیں مقدس و محترم بھی ہے۔ جستجو کا یہ سفر کٹھن ضرور تھا لیکن رشید امجد اپنے حسن طلب کی بدولت اس میں بدرجۂ اتم سرخرو ہوئے۔ ایک کہنہ مشق استاد، ماہر تعلیم، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے انہوں نے اپنے آپ کو منوایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سطح پر ان کے مرتبۂ علم و فضل کا اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں فیڈرل گورنمنٹ ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن ڈائریکٹوریٹ جی ایچ کیو حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں بہترین استاد کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ادارہ نقوش کی طرف سے ان کو بہترین ادبی خدمات پر نقوش ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ۲۰۰۲ء میں رائٹرز اینڈ ایجوکیشنسٹس کلب پاکستان نے ایوارڈ آف ایکسیلینس دیا۔ ۲۰۰۴ء میں میاں محمد بخش اکیڈمی پاکستان کی طرف سے میاں محمد بخش ایوارڈ ملا اور ۲۰۰۶ء میں حکومت پاکستان نے ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو پرائڈ آف پرفارمنس پیش کیا۔ اس کے علاوہ اندرون و بیرون ملک ان کی خدمات کو غایت درجہ سراہا گیا اور دنیائے علم و ادب میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو ان کے نام و کام سے واقف نہ ہو۔

ڈاکٹر رشید امجد کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف جامعاتی تحقیق میں بھی ہوا۔ پاکستان و بھارت کی مختلف جامعات میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے گئے اور ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ان مقالات کو سند حاصل ہوئی۔ ۱۹۸۲ء میں زکریا یونیورسٹی ملتان میں 'رشید امجد بحیثیت افسانہ نگار' کے موضوع پر ایم اے اردو کے لیے مقالہ لکھا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں اسی یونیورسٹی میں 'رشید امجد کے افسانوں کا تکنیکی مطالعہ' کے موضوع پر' ۲۰۰۶ء میں پنجاب یونیورسٹی میں 'رشید امجد کے افسانوں میں مرشد کا کردار' اور ۲۰۰۶ء میں جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں 'رشید امجد کے افسانوں میں مابعدالطبیعاتی عناصر' کے موضوع پر ایم اے اردو کے لیے مقالات لکھے گئے۔ ۲۰۰۳ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں 'رشید امجد کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ' کے عنوان سے ایم فل کے لیے مقالہ مکمل ہوا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھارت میں 'رشید امجد کی ادبی خدمات' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لیے ایک مقالہ زیر تکمیل ہے۔

ساٹھ کی دہائی و مابعد' اردو ادب میں جو انقلابی تبدیلیاں آئیں' رشید امجد ان میں ایک سرخیل کی حیثیت سے موجود رہے۔ حلقہ ارباب ذوق کی تنظیم نو اور جدیدیت کو نظری و عملی سطح پر واضح کرنا ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس دور کے ادبی رسائل و جرائد اور محافل و مجالس میں رشید امجد کی توانا آواز سب سے نمایاں رہی۔ انہوں نے اپنے آپ کو علم و ادب کی ترقی کے لیے وقف کیے رکھا اور کسی دباؤ میں آئے بغیر جدید نظریہ ادب کے پھیلاؤ کی سعی کی۔

ڈاکٹر رشید امجد نے بیسیوں مقالات اور سینکڑوں تجزیے و تبصرے لکھے جو ہم عصر ادبی رسائل و جرائد میں تواتر سے چھپتے رہے۔ ادبی مجالس اور سیمینارز میں ان کی مباحث اس پر مستزاد ہیں۔ مختلف تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر ان کی مطبوعہ کتب کی تعداد ۱۴ ہے۔ اس کے علاوہ ایک خودنوشت اور ۱۲ افسانوی مجموعے بھی ان سے یادگار ہیں۔ اس علمی خزانے کی فہرست ذیل میں درج ہے۔ ساتھ ہی اہم مطبوعات کی اجمالی تعارف بھی پیش ہے۔

مطبوعات:

☆ تنقید/تحقیق:

۱۔ نیا ادب' تعمیر ملت پبلشرز منڈی بہاؤالدین' ۱۹۶۹ء

۲۔ رویے اور شناختیں' مقبول اکیڈمی' لاہور' ۱۹۸۸ء

۳۔ یافت و دریافت' مقبول اکیڈمی' لاہور' ۱۹۸۹ء

۴۔ شاعری کی سیاسی وفکری روایت' دستاویز مطبوعات' لاہور' ۱۹۹۳ء

۵۔ میراجی۔ شخصیت اور فن' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' لاہور' ۱۹۹۵ء

۶۔ پاکستانی ادب کے معمار (میراجی)' اکادمی ادبیات پاکستان' ۲۰۰۶ء

☆ ترتیب و تالیف:

۱۔ پاکستانی ادب (چھ جلدیں) ایف جی سر سید کالج راولپنڈی ۱۹۸۰ء

۲۔ اقبال۔ فکر وفن ندیم پبلی کیشنز راولپنڈی ۱۹۸۴ء

۳۔ تعلیم کی نظریاتی اساس ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء

۴۔ میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۱ء

۵۔ پاکستانی ادب (نثر) ۹۰ء اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۱ء

۶۔ پاکستانی ادب (نثر و افسانہ) ۹۱ء اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۲ء

۷۔ پاکستانی ادب (نثر و افسانہ) ۹۴ء اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۵ء

۸۔ مزاحمتی ادب اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۵ء

☆خودنوشت:

۱۔ تمنا بے تاب حرف اکادمی راولپنڈی ۲۰۰۱ء-۲۰۰۳ء

☆افسانوی مجموعے:

۱۔ کاغذ کی فصیل دستاویز مطبوعات لاہور ۱۹۹۳ء

۲۔ بیزار آدم کے بیٹے دستاویز پبلشرز راولپنڈی ۱۹۷۴ء

۳۔ ریت پر گرفت ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی ۱۹۷۸ء

۴۔ سہ پہر کی خزاں دستاویز پبلشرز راولپنڈی ۱۹۸۰ء

۵۔ پت جھڑ میں خودکلامی اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی ۱۹۸۴ء

۶۔ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۸۸ء

۷۔ دشت نظر سے آگے (کلیات) مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۱ء

۸۔ عکس بے خیال دستاویز مطبوعات لاہور ۱۹۹۳ء

۹۔ دشت خواب مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۳ء

۱۰۔ گم شدہ آواز کی دستک فیروز سنز لاہور ۱۹۹۶ء

۱۱۔ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں حرف اکادمی راولپنڈی ۲۰۰۲ء

۱۲۔ ایک عام آدمی کا خواب حرف اکادمی راولپنڈی ۲۰۰۶ء

اہم مطبوعات۔ تعارف و تبصرہ:

ا۔ میراجی شخصیت و فن:

'میراجی شخصیت و فن' ڈاکٹر رشید امجد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ کتابی صورت میں پہلی مرتبہ اسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ صفحات کی کل تعداد ۳۷۵ ہے۔ کتاب کا پہلا باب میراجی کے خاندان' سوانحی حالات اور شخصیت پر ہے۔ دوسرا باب 'میراجی کی نظمیں' کے عنوان سے ہے۔ تیسرا باب میراجی کے گیتوں اور غزلوں پر ہے۔ چوتھے باب میں میراجی کی تنقید کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پانچواں باب میراجی کے تراجم سے متعلق ہے اور چھٹے باب میں میراجی کی مجموعی شخصیت اور ادبی مقام کے حوالے سے بحث ہے۔

میراجی اپنے عہد کی ایک قدآور ادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے نہ صرف اردو نظم کو نئے ذائقے سے روشناس کرایا بلکہ تنقید و تراجم میں بھی نئے پن کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی ساتھ ادبی سرگرمیوں میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے اس کتاب میں ان کے جملہ پہلوؤں کا عمدگی سے احاطہ کیا ہے۔ پہلے سے موجود مواد اور آرا کو انہوں نے نہایت دقت نظری سے دیکھا دکھایا ہے۔ تاکہ میراجی کی شخصیت و شاعری کے بارے میں جو ابہام عام ہے اس کو دور کیا جا سکے۔ اپنی اس کاوش میں وہ یقیناً کامیاب ہوئے ہیں اور نہ صرف میراجی کی ذات کو اصل روپ میں آشکارا کیا ہے بلکہ اس پورے عہد کے فکری و نظری پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ یوں یہ کتاب انیسویں صدی میں اردو شاعری کا ایک نہایت وقیع تجزیہ بن جاتی ہے۔ کتاب کی اہمیت اس سے بھی واضح ہے کہ اپنی اولین اشاعت کے بعد سے اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہر سطح پر اسے سراہا گیا ہے۔

۲۔ پاکستانی ادب (چھ جلدیں)

پاکستانی ادب کی اشاعت ایف۔جی سرسید کالج راولپنڈی کے زیر اہتمام ہوئی۔ اس اشاعتی منصوبے میں پاکستانی ادب کے متنوع پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلی جلد پاکستانی ثقافت و علاقائی ادب پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد افسانہ' سفرنامہ' طنز و مزاح اور انشائیہ کا احاطہ کرتی ہے۔ تیسری جلد شاعری پر ہے۔ چوتھی فنون لطیفہ پر۔ پانچویں تنقید پر اور چھٹی جلد میں ڈراما سے متعلق مواد کی جمع بندی ہے۔ اس جلد کے دو حصے ہیں۔ پاکستانی ادب صحیح معنوں میں ایک ایسا انتخاب ہے جس کی اس سے قبل کوئی مثال نہیں ملتی۔ ڈاکٹر رشید امجد نے انتخاب و ترتیب میں اپنی بھرپور تالیفی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ اس سے نہ صرف پاکستانی ادب کی جملہ اصناف محفوظ ہو گئی ہیں بلکہ محققین و ناقدین کے لیے بڑی سہولت بھی بہم پہنچی ہے۔ ورق ورق بکھرے مواد کو تلاش کرنا اور پھر اہم و کم اہم کا تعین کر کے اسے ایک منضبط شکل میں سامنے لانا ایک انتہائی نازک فریضہ تھا' ڈاکٹر رشید امجد نے یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا۔ ان کی اس محنت کا اندرون و بیرون ملک اعتراف کیا گیا اور ہر سطح پر اس کی حد درجہ تعریف ہوئی۔ پانچویں جلد کے فلیپ کے دو اقتباس ملاحظہ ہوں:

'پاکستانی ادب کی چار جلدیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ یہ کام بہت خوب ہے۔ سرسید کالج اس کام کے لیے لائق مبارکباد ہے۔ اس طرح بہت سے شہ پارے ضائع ہونے سے محفوظ ہو گئے اور بہت سی اصناف میں بکھرے ہوئے نوادر یکجا ہو گئے ہیں۔'

(گوپی چند نارنگ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی بھارت)

'پاکستانی ادب کا یہ انتخاب اردو ادب کی بہت اہم اور ضروری خدمت ہے۔ اس میں اردو کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے بہت اہم مواد پیش کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر پاکستانی ادب کے متعلق بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ہم نے اس انتخاب میں بہت سی خوبصورت تخلیقات اپنی نصابی کتابوں میں شامل کر لی ہیں۔'

(مادام شان یون۔ صدر شعبہ اردو پیکنگ یونیورسٹی عوامی جمہوریہ چین)

۳۔ یافت و دریافت

'یافت و دریافت' ڈاکٹر رشید امجد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو مقبول اکیڈمی لاہور سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ صفحات کی تعداد ۱۸۴ ہے۔ کتاب میں ۲۷ مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین عملی تنقید کا ایک خوبصورت اور قابل قدر نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا' میرزا ادیب' پروفیسر فتح محمد ملک' سمیع آہوجا' منصور قیصر' کشور ناہید' منظور عارف' بشیر سیفی' احمد جاوید' سلیم آغا اور محمود کنور کے فن اور تازہ کتب کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہیں ایک مضمون' تین نئے غزل گو' کے عنوان سے ہے جس میں ظفر اقبال' شہزاد احمد اور شکیب جلالی کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اردو ہائیکو اور نئے افسانے کے بارے میں بھی ایک ایک مضمون ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی نظریہ ثقافت' ادب اور سیاست' اور حلقہ ارباب ذوق کے ایک سال پر بھی مضامین شامل کتاب ہیں۔

۴۔ رویے اور شناختیں:

'رویے اور شناختیں' مقبول اکیڈمی لاہور سے نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ صفحات کی تعداد ۱۵۶ ہے۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر ۲۱ مضامین شامل ہیں۔ یہاں عملی تنقید کے ساتھ ساتھ نظری مباحث بھی ہیں۔ ادب میں انتخاب کے اصول' تنقید و تحقیق کا ربط باہم' ترجمہ کا فن' حرف و صوت کا رشتہ اور اسلوب کیا ہے' ایسے مضامین ہیں جو مصنف کی قابلیت علمی کا بھرپور اظہار لیے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک عالمانہ شان اور بحث کا رویہ نمایاں ہے۔ ان کے علاوہ انشائیے پر دو مضامین بھی کتاب میں شامل ہیں۔ دیگر مضامین کی تفصیل یہ ہے: غالب کی بنی ہوئی شخصیت کا مسئلہ' اقبال کا تصور زمان و مکاں' ناول میں منظر نگاری' اظہار کی معنویت' میرزا ادیب کے افسانے' وزیر آغا کی نظموں کا فکری پس منظر' جمیل ملک کا شعری سفر' نئی اردو کہانی اور خالدہ حسین' شہاب نامہ' شبنم مناوری کا پانی پر بہتا پھول' جلیل عالی کا خواب دریچہ' اور منشا یاد کے افسانے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے یہ مقالات ان کی بھرپور تنقیدی بصیرت کا عمدہ

اظہار ہیں۔ کتاب کا فلیپ مرزا ادیب کا تحریر کردہ ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

'ڈاکٹر رشید امجد تنقید کے کسی بھی معروف مکتب سے تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے اس نوعیت کے طریق عمل کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ میں صاف اور واضح لفظوں میں اپنا مفہوم ادا کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ بس ایک نقاد ہیں۔ ایک ایسے نقاد جس کا اصل فریضہ انکشاف حقیقت ہے۔ مگر یہاں اس امر سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ رشید امجد ایسے انکشاف کے روادار نہیں ہیں جو اپنے ساتھ تحیر آفرینی کی کیفیت لاتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے یہاں تو احساس طمانیت اور نمود مسرت ہے۔ ان کی روشن روشن، اجلی اجلی، صاف صاف ناقدانہ تحریریں اپنے اندر بصیرتوں کی ایک گراں بہا متاع لیے ہوئے ہیں اور ان کا قاری اس متاع سے بہرہ مند ہونے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ 'رویے اور شناختیں' رشید امجد کے تنقیدی مضامین پر مشتمل دوسرا مجموعہ ہے اور اس میں بڑا تنوع اور بڑی رنگا رنگی ہے۔ ان مضامین میں نظریاتی بحث کم اور عملی تنقید سے متعلق مقالات بیشتر تعداد میں ہیں اور یہ مقالات فکر انگیز بھی ہیں اور خیال افروز بھی۔'

(میرزا ادیب۔ فلیپ: رویے اور شناختیں)

۵۔ تمنا بے تاب:

یہ ڈاکٹر رشید امجد کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ حرف اکادمی راولپنڈی سے اس کی اشاعت ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ء اور تیسرا ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر رشید امجد کے جملہ حالات وکوائف' جدوجہد علمی اور اپنے عہد کے مجموعی رویوں کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ دیباچے میں وہ لکھتے ہیں: 'معروف معنوں میں یہ خودنوشت نہیں بلکہ یادیں' خیالات' تجزیے اور مختلف اشیا کے بارے میں میرے نقطہ ہائے نظر ہیں، جن میں میری نجی زندگی اور میرا عہد دونوں شامل ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا' سنا اور محسوس کیا اسے بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے۔'

'تمنا بے تاب' ڈاکٹر رشید امجد کی ذات' خیالات اور ان کے مزاج کو سمجھنے میں ایک اہم حوالہ ہے۔ کتاب کو پڑھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عظمت کوئی بنی بنائی شے نہیں بلکہ اس کا ہر ہر زاویہ سخت کوشش، لگن اور بھرپور جدوجہد میں پیوست ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کی عظمت بھی ان کے اپنی ذات پر جھیلے کٹھن لمحوں کا حاصل ہے۔ اس طویل سفر میں انہوں نے جو ریاضت کاٹی وہ اس کتاب کے ورق ورق پر نمایاں ہے۔ اپنی اشاعت اول سے اب تک اس کتاب کی مقبولیت میں دم بدم اضافہ ہی ہوا' کمی نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یقیناً خلوص اور دیانتداری کی وہ روایت ہے جو کتاب کے حرف حرف میں اپنا اظہار پاتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے حقائق واقعی کو نہایت عمدگی سے سادہ اور رواں بیانیے میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے فلیپ پر شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

'اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے اس کتاب میں کتنی دلچسپیاں اور کتنی نکتہ آفرینیاں بھردی ہیں۔
آپ نے صحیح کہا ہے کہ اس کتاب میں ایک پوری نسل کے ادبی اور پورے عہد کی تصویر کو سمودیا گیا ہے۔
گزشتہ پندرہ بیس برس میں ہمارے بزرگوں اور معاصروں نے خودنوشتیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر کو میں نے پڑھا اور تقریباً ہر خودنوشت نے مجھے مایوس کیا۔ مایوسی کی وجہ یہ نہیں کہ تمام خودنوشتوں میں کم یا زیادہ جھوٹ کی آمیزش ہے مایوسی کی وجہ یہ تھی کہ کسی خودنوشت نگار نے اپنے ذہنی ارتقا' اپنے فکری رجحانات اور اپنے تخلیقی سفر کی کشاکش کا ذکر نہیں کیا۔ آپ کی خودنوشت میں جگہ جگہ آپ کی اور آپ کے عہد کی دانشورانہ زندگیوں کا صاف ستھرا اور بے تکلف بیان ہے۔ آپ نے اپنی خودنوشت میں بیانیہ کا بے حد خوبصورت اور لاجواب طرز اختیار کیا ہے۔'

(شمس الرحمٰن فاروقی۔ فلیپ: تمنا بے تاب' اشاعت دوم)

فلیپ ہی کی ایک اور عبارت ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحریر کردہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
'آپ پر اپنا عہد لکھنا واجب تھا۔ آپ کی جرأت اظہار اور آپ کی دل گداختگی متاثر کرتی ہے اور آپ کو بے چہرے ہم عصروں کے غبار میں بہت روشن اور منور بناتی ہے۔ آپ کو زندگی کے گہرے پانیوں میں اترنے اور رویوں کی خوبصورتی اور بدصورتی کو دیکھنے اور دکھانے کی توفیق نصیب ہوئی' یہ کچھ کم اہم بات نہیں۔'

(ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ فلیپ: تمنا بے تاب' اشاعت دوم)

۶۔ دشت نظر سے آگے: (کلیات)

'دشت نظر سے آگے' مقبول اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۱ء میں شائع کی۔ اس کلیات میں ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں کے چھ مجموعے یکجا ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے: بیزار آدم کے بیٹے۔ ریت پر گرفت۔ کاغذ کی فصیل۔ سہ پہر کی خزاں۔ پت جھڑ میں خود کلامی۔ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے۔ بعد میں مزید پانچ مجموعے شائع ہوئے جن میں 'عکسِ بے خیال'، 'دشتِ خواب'، 'گم شدہ آواز کی دستک'، 'ست رنگے پرندے کے تعاقب میں' اور 'ایک عام آدمی کا خواب'۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے اپنے عہد کے مسائل کا اظہاریہ ہیں۔ ذات' ماحول اور کائناتی دائروں میں فرد کی ذہنی کیفیات اور احساسات کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور زندگی کی دیکھی وان دیکھی دنیاؤں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ جبر کے خلاف احتجاج ومزاحمت بھی ان کے ہاں نمایاں ہے اور متصوفانہ رجاییت بھی۔ انہوں نے حیات کو کسی مخصوص نظریاتی پس منظر میں دیکھنے کی بجائے آزادہ روی اور نان کمٹڈ رویے سے دیکھا دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کردار ماحول اور فضا بندی کے عناصر ایک مخصوص زمانی منطقے ومکانی دائرے میں ہونے کے

باوجود آفاقی سطح پر اپنی پہچان کراتے ہیں۔ اظہار کی سطح پر علامت' تجرید اور تمثیل سے انہوں نے خوب کام لیا اور ساتھ ہی دیگر شعری وسائل مثلاً تشبیہ' استارہ اور صنائع کو بھی عمدگی سے برتا۔ فکر اور اسلوب کی یہی تازگی اور فن میں مہارت نہ صرف ان کو معاصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے بلکہ اس حوالے سے ارفعیت کا مقام بھی بخشتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا' رشید امجد کی اس انفرادیت کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'انتظار حسین نے پیچھے ہٹ کر کتھا اور داستان سے رشتہ جوڑا اور انور سجاد نے آگے بڑھ کر مستقبل کو زیر دام لانے کی کوشش کی۔ جبکہ رشید امجد نے حال کے نقطے پر کھڑے ہو کر ماضی اور مستقبل دونوں سے رابطہ قائم کیا۔ یہی اس افسانہ نگار کے فن کا امتیازی وصف ہے کہ وہ زنجیر کے کسی ایک سرے سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ پوری زنجیر سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔'

(ڈاکٹر وزیر آغا۔ رشید امجد کے افسانے۔ مطبوعہ 'روشنائی'، کراچی، ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر رشید امجد اپنے ادبی سفر کے آغاز سے اب تک مقتدر علمی شخصیت کے طور پر نمایاں رہے ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار' نقاد اور ماہر تعلیم انھوں نے اپنے عہد کی ادبی زندگی میں نہایت فعال کردار ادا کیا۔ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی انھوں نے مختلف سیمینارز میں شرکت کی۔ ۲۰۰۵ء میں سارک افسانہ کانفرنس منعقدہ علی گڑھ بھارت میں بطور مندوب شریک ہوئے اور حال ہی میں ملتان میں منعقدہ اردو کانفرنس میں صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ 'دستاویز'، 'اقرا'، 'تخلیقی ادب' اور 'دریافت' کی ادارت' اکادمی ادبیات کے اشاعتی منصوبہ 'منتخب پاکستانی ادب' کی سات جلدوں کی ترتیب اور مختلف جامعات میں سو سے زیادہ ایم فل' پی ایچ ڈی مقالات میں تحقیقی معاونت بھی ان کے علمی تسلسل کا حصہ ہے۔ اس تمام جدوجہد کو مدنظر رکھتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر رشید امجد پاکستان میں اردو ادب کے ایک ایسے مربی و محسن ہیں جن پر حامیانِ اردو جتنا ناز کریں کم ہے۔

ناصر شہزاد

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی میگھ ملہار اور اس کی پہلی پھوار

''گیت'' کے بعد برصغیر پاک و ہند کی شعری اساطیر میں سب سے پہلے تنویر ''دوہا'' کو ملی۔ ''گیت'' کا اجراء تب ہوا جب عہد آفرینش کا انسان کوہساروں کی تنگ غاروں سے نکل کر مرغزاروں کے نہنگ نظاروں میں باہر آیا۔ اور ''دوہا'' یہاں کی شعری بوطیقا میں تب وثیقہ ہوا جب اجمیر کا جنگ جُو اور خرم خُو جوان حکمران مہاراج پرتھوی راج چوہان اپنی منوہر مُو اور خوبرو محبوبہ، قنوج کی راج کماری سنجوگتا کو سوئمبر سے اٹھا کر اجمیر میں لایا۔ پرتھوی راج کے ایک ممتاز درباری شاعر چندر بروائی نے گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کے لیے ایک کتاب ''پرتھوی راج راسو'' لکھی جس میں پرتھوی راج کے دیگر جنگی کارناموں کے ساتھ ساتھ پرتھوی اور سنجوگتا کی لافانی محبت کے سنجوگ اور بجوگ کو ایک کہانی کے ہنگاموں اور سرناموں سے گزارا۔ اس کہانی کا احاطہ کرنے کے لیے چندر بروائی نے برصغیر کی کئی ایک اصناف سخن کو اپنے فنی غرناطہ کے طور پر برتا۔ دوہا وہاں استعمال ہوا جہاں راج کماری سنجوگتا اور راجکمار پرتھوی راج کے مابین فراق اور وفاق کے مناظر کو ناظر کرنا تھا۔ اگر چہ ان ''دوہوں'' کی زبان بڑی گنجان اور بے نر دبان ہے اور جدید ہندی کے ودوانوں کی پہچان سے بھی باہر۔ مگر اس سے یہ معمہ ضرور حل ہو گیا ہے کہ دوہا گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں دستور ہوا۔ چندر بروائی نے ''پرتھوی راج راسو'' میں ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ ''پنکتیاں'' (مصرعے) کہیں۔ اس سے اس کی قادر الکلامی اور دوامی سربلندیوں کا پتہ چلتا ہے۔ چندر بروائی، چندیری کی دوسری جنگ میں پرتھوی راج کے ہمراہ مسلمان بادشاہ شہاب الدین محمد غوری کے ساتھ لڑتا ہوا ۱۱۹۲ء میں میدان کارزار میں کام آیا۔ مگر ''پرتھوی راج راسو'' کے توسط سے ان ہنگام میں اپنے نام کو ہمیشہ کے لیے بادوام کر گیا۔

چندر بروائی کے فوری بعد بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں میواڑ کی راجکماری مہارانی میرابائی، بھگت کبیر، ملک محمد جائسی، رام دت، ودیاپت اور جے دیو کا زمانہ ''دوہا'' کے ٹھکانا میں فسانہ ہوا۔ اس آئینہ خانہ میں رام بھگتی اور کرشن بھگتی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور مذکورہ شعراء میں ''بھگت کبیر'' کے علاوہ بھی شعراء اپنے اپنے چہروں کا عکس، کرشن بھگتی تحریک کے رقص میں دیکھ رہے تھے، بہت ہی ظاہر اور طاہر اشکال میں۔ مہارانی میرابائی کے اس شعر کی مصداق:

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، موہے پیا ملن کی آس

اس تحریک کے نزدیک ہو کر جے دیو نے کرشن جی مہاراج کے لیے ''گیتا گوبند'' لکھی جو کرشن جی مہاراج کے عارفانہ فضائل کے علاوہ شریمتی رادھا جی کے سنگ ان کی معتبر اور متبرک محبت کے مسائل کا حل بھی ڈھونڈتی ہے۔ بھگتی تحریکوں میں رام بھگتی اور کرشن بھگتی 'سگن واد' کے نام سے بامراد ہوئیں۔ مورتی پوجا اور اوتار واد انہی تحریکوں کی روداد بنے۔ مگر بھگت کبیر کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ وہ اللہ کے الوہی نشان کو اپنی روح کے نروان میں غوطہ لگا کر پہچان رہے تھے بغیر کسی دنیاوی نروبان اور دھیان کے:

لالی مورے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں گئی میں بھی ہو گئی لال
آؤ پریتم موہنا پلک موند توہے لوں
نہ میں دیکھوں اور کو نہ تو ہے دیکھن دوں

ان سبھی مکمل اور معزز شعراء کے بعد' کچھ وقفہ اور وقت' مہا کوی بہاری لال کے ساتھ رام بھگتی تحریک کے رفیق تلسی داس' سورداس' چرن داس' گنگ کوی' عبدالرحیم (رحمن) خان خاناں اور کیسوداس ایسے ہونہار شاعر دوہا کے اطاعت گزار بنے اور دوہا کہنے میں ایسی ایسی فنی جولانیاں دکھائیں جو ہمیشہ کے لیے دوہا کی تابانیوں کی جلوہ سامانیاں بن گئیں۔ صرف ایک کیسوداس نے پچھتر ہزار دوہے کہے اور محاسن شعری پر کوی پریا جیسی اور دوہا کے عروض پر پہلی دستاویزی کتاب ''رام الن کرت منجری'' ہمارے ہم رکاب کی۔ دوہا کے لیے یہ بڑا زینت زماں اور زیب داستاں دور تھا کہ دوہا کی نئی نئی اصطلاحیں اپنی اپنی بارگھوں کی راہی بنیں۔ مہا کوی بہاری لال نے دوہا کے رس اور جس ترتیب دیئے اس انداز سے کہ ان کی آواز دیگر دوہا نگاروں کی دم ساز بن گئی۔ شرنگار رس' شانت رس' کانت رس' انگ ارپن' رنگ درپن' وچتر دید' نائیکہ بھید' نک سک' مایا موہ' یوگ' پریوگ' راس بودھ' راس پنچ اور چھایا وادی آج تک دوہا نگاروں کی آبادی کے اتحادی ہیں۔ عبدالرحیم خان خاناں (رحمن) مغل بادشاہ اکبر کی افواج کے نہ صرف سپہ سالار تھے' بلکہ دوہا کے بھی بہت بڑے پالن ہار' شعراء کے سرپرست اور راست دست تھے۔ کہتے ہیں کہ دربار اکبری کے ممتاز شاعر گنگ کوی نے دوہوں کا ایک چھپہ (چھ دوہے) کہہ کر ان کی نذر کیا اور انہوں نے دان میں اسے چھتیس لاکھ روپے پردھان کر دیئے۔ اکبر دلی سے جب اپنا پایہ تخت آگرہ کی طرف لے کر گیا تو خان خاناں (رحمن) نے وہاں اپنے لیے ایک حویلی تعمیر کرائی اور اس کے نام کی تفسیر کٹڑۂ خان خاناں سے تعبیر کرائی۔

اردو غزل کے معجز بیاں شاعر مرزا اسداللہ خان غالب اپنے بچپن کے ایام میں اسی کٹڑۂ خان خاناں میں عزت اماں رہے۔ رحمن کے دو دوہے سنیئے:

''رحمن'' انگیا نیل کی رُت میں پھٹی رتیک
منو کسوٹی ہیم پر دیو ہیم کی لیک

"رحمن" دھاگا پریم کا مت دیکھو چٹکائے

جوڑیں تو ناہیں جڑے بیچ گانٹھ پڑ جائے

مذکورہ بالا دور دوہا نگار شعراء کو شہرت کے نصف النہار تک پہنچا کر گیا۔ یہ سبھی شاعر تو دوہا نگاری میں انتہائی باج گزاری اور خواستگاری کے منصب پر فائز تھے۔ ادھر اکا دکا دوہا لکھنے والے شعراء کو بھی بڑی ابد کناری ملی۔ جیسے امیر خسرو، جیسے بوعلی قلندر۔ چودھویں صدی عیسوی میں سکھ مذہب کے دسویں گرو شری گوبند سنگھ نے گرنتھ مہاراج کو مرتب کیا۔ اس کے بعد دوہا کی دشا ایک مکمل سناٹے اور گھاٹے سے دوچار رہی۔ بیچ میں بھوشن جیسا کوئی شاعر آیا بھی تو اپنے سامعین اور قارئین کے دل جیتنے میں بے گام اور بے دوام ہی رہا۔ انگریزی دور میں تو دوہا نظم اور غزل کے بوجھ کے نیچے دب کر بے اوج ہو گیا۔ مگر بٹوارے کے بعد یہ اپنے اصل گوشوارے کی طرف بڑھا اور اس میں الیاس عشقی اور جمیل الدین عالی ایسے "درسالی" شاعر خیر سگالی کے طور پر سامنے آئے۔ الیاس عشقی اگرچہ بڑے شاعر تھے مگر یہ زیادہ تر دوہا کی بحور "دوہا چھند" اور "سرسی چھند" کے چکر ہی میں دوہا کے شعری تفکر سے الجھے رہے۔ مگر ان کے برعکس جمیل الدین عالی نے مجید امجد کے ان دو اشعار کی تکمیل میں اپنے فن کی آگے ترسیل کی:

میلی چادر تان کر اک چوکھٹ کے دوار

صدیوں کے کہرام میں سو گئے کیا کیا لوک

دھیمے دھیمے بول میں دوہے کا ہنڈول

سن سن اس کو باؤرے ہو گئے کیا کیا لوگ

عالی جی نے دوہا کی ایک نئی بحر کو لہر کیا جو سرسی چھند اور دوہا چھند کے ساتھ ساتھ دلبند ہو رہی ہے اور عالی چال کے وصال سے دوہا کے محاسن اور آسن کو اپنے اندر اجال رہی ہے۔ دوسرا اعجاز جو اللہ نے ان کے لیے رقم طراز کیا وہ ہے عالی جی کی آواز کا جادو، جو بے قابو ہو کر سر پر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ سو ان سب وجوہات کی بنا پر عالی کا بہت تتبع ہوا اور عالی کی پیروی میں تاج سعید اور شمس فاروقی جیسے مستند شاعر سامنے آئے۔ مگر دوہا میں دلربائی اور رعنائی ہندوستان سے بھگوان داس اعجاز اور پاکستان سے جمیل عظیم آبادی، پرتو روہیلہ اور ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے لیے زیبائی بنی۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون جلدی امراض کے ایک بلند پاور اور ٹھک ٹھاک نادر ڈاکٹر ہیں اور یہی اعجاز انہوں نے اپنی دوہا نگاری کے لیے بھی رقم طراز کیا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میگھ ملہار ان کا پانچواں مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے صنف دوہا کے چار مجموعے ترتیب دے کر وہ اپنے آپ کو باتہذیب شعراء میں شامل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر جی نے یوں تو دوہا نگاری کی بھی اصطلاحوں کو اپنی فنی شاہراہوں سے گزارا ہے مگر انگ ارپن رنگ درپن، شانت رس، کانت رس، وچتر دید اور نائیکہ بھید میں جو شاعری کی ہے وہ انہیں ادب کی مزین اور پرتعین محل سراؤں میں ایک مکمل راجکمار کی طرح استوار کر رہی ہے۔ میرے اپنے اس شعر کی طرح:

ماس پہ تانی باس پیا کی انگ پہ اوڑھا اس کا رنگ
لے لو قسم سکھی پریتم کے ہم پریتم کی سوگند ہوئے

ڈاکٹر جی کا ایک دوہا سنیے:

پیلی چنری دیکھ کر سرسوں کی یاد آئی
بکھرے رنگ بسنت کے پروا سپنے لائی

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے ہاتھوں میں رنگوں کے اتنے پلندے ہیں کہ وہ اپنے قارئین کی گردنوں میں کچھ الوہی امنگوں کے پھندے ڈال دیتے ہیں۔

سکھیاں مجھے پکارتیں بیتی سندر رات
سپنے کیسے چھوڑ دوں ساجن کی سوغات

یہ اتنی مہین اور انگبین کویتا ہے کہ آتما میں پہچان پریتا اور گیان گیتا کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ چٹکتے پھول اور مہکتی ہوئی زمین کے ارض وطول کی مانند۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے خوبرو جذبات کی مشکبو واردات کے اندر جھانک کر دیکھا ہے اور وہاں سے ایسے متوالے...... اجالے اکٹھے کئے ہیں جو دوہا کے پیکر پر صدیوں تک اپنے زربفت اجالے ڈالے رہیں گے۔

پیلی میری اوڑھنی مہندی لاگے ہاتھ
سرسوں پھولی کھیت میں پیا کرے نہ بات

دیکھئے اس دوہا میں کتنی متواری اور کتنی نیاری من کامنائیں جاگ اور سہاگ رہی ہیں جو کچھ خوابیدہ کہانیاں کہہ بھی رہی ہیں اور کچھ شنیدہ شادمانیوں میں بہہ بھی رہی ہیں۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے دوہے میں کچھ اتنے خوبصورت مضمون آئے ہیں جو جگہ جگہ لجیلی اور شرمیلی مہورتیں ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔

جیون کی ہر باٹ پر چل کر اس کے سنگ
میں نے بھی اپنا لیا دھانی اس کا رنگ

ڈاکٹر جی' جو کچھ بھی دوہا میں کہنا چاہتے ہیں بڑی آسانی اور بڑی معجز بیانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ دیکھئے غالب کے ایک شعری خیال کو کس طرح انہوں نے اپنے ذہنی جمال میں اجال دیا ہے:

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
(غالب)

سو مجھ سے جھلائے تو لاکھ چھڑائے ہات
لاگے میٹھی چاشنی کڑوی تیری بات
(طاہر سعید ہارون)

دوہا کے رنگ کو اس سے زیادہ نہنگ کرنا نا معلوم فرسنگ کا سفر ہے۔ غالب کا ایک شعر اور دیکھیں:

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اس خیال کے بول انہوں نے اپنے ایک دوہا میں یوں پرچول کیے ہیں۔ کتنی سرمستی اور چابکدستی سے:

جس سے جیون بھر ڈرے شیتل نکلی آگ
جل گئے پر ہم اوس سے اپنے اپنے بھاگ

یہاں میں اپنی ایک غزل کا ایک شعر دے رہا ہوں:

بھنورے نے اس کو دیکھا کہا "آ کنول مکھی"
جگنو دراز زلف کے گھونگر میں پھنس گئے

اس خیال کی ہیئت اور شعیت ڈاکٹر جی کے ایک دوہا میں دیکھئے جو من کو ایک علیحدہ طرح سے موہ اور کھوہ (چھین) رہی ہے۔

عجیب التجا اور عجیب دعا کے ساتھ:

سندرتا کیا چیز ہے گوری کیا بتلائے
بھگون کی یہ دین ہے کوئل گاتی جائے

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہالی کویتا میں بڑے برہالی کیفیتیں ہیں' خیر سگالی کے نشوں سے چور اور اندمالی مرہموں سے معمور۔ ڈاکٹر جی کے دوہوں میں برصغیر کی تصویر پوری دانشوری سے تعمیر ہو رہی ہے۔ انہوں نے اپنے پورے وثوق اور اپنی پوری مدھوک محویتوں کے ساتھ دوہا کہا ہے جو اپنے وجود اور اپنے شعری معبود کے لیے سربسجود ہے۔ رنگوں کی رسیلی روانیوں اور رنگیلی کہانیوں کی طرح:

ڈھولا لینے آ گیا کہتا ہے یہ ڈھول
بابل کا گھر چھوڑ کر اڑنے کو پر تول

شعری جذبات کی یہ نرم و نازک تہیں ابدی آگہی کی بارگہیں ہیں جہاں سدا سرسوں پھولتی اور پروا جھولتی ہے۔ برصغیر کی اس زینت آسا زمین اور تزئین کی طرح۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون خوبصورت انسانی زندگی اور اس خوبصورت تابندگی کی شاعری کرتے ہیں

جس کے اندران منطقوں میں چلنے والی ہوا کے الاپ بھی ہیں اور گھٹاؤں سے برکھاؤں میں ڈھلنے والی بوندنیوں کی تھاپ بھی۔ ممکن ہے دوہا کی کئی ایک دوسری اصطلاحوں میں کوئی شاعر ڈاکٹر جی کا لگا کھائے۔ مگر انگ ارپن اور رنگ درپن کی شاعری کی چھایاوادی جس طرح ان کی اتحادی بنی ہے اس میں کوئی دوسرا شاعر ایسا نہیں جو ان کی برابری کی منادی کر سکے۔

دوہا کی سب اصطلاحیں ان کی نگاہ میں پناہیں ڈھونڈھ رہی ہیں کیونکہ وہ دوہا کے گل کار گندھرب گواہ شاعر ہیں۔ قدیم دوہا کی زبان زیادہ تر برج بھاشا کے ایوان سے باپہچان رہی ہے۔ ''برج'' شریمتی رادھاجی کے گاؤں کا نام ہے اور بھاشا اس کی بولی کو کہتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے اسے جدید اردو کے قریب کر کے نہایت وحید کر دیا ہے۔ ڈاکٹر جی کے دوہوں کی بولی ہر جگہ دوہا کی ہم جولی یکے طور پر رندھور ہوئی ہے۔ نہایت ہی سلیس، نفیس، رئیس اور بیتال بتیس پیرایہ میں، جہاں دوہا کی دلربائی انتہائی زیبائی کے قریب ہے۔ اپنے ماترہ، چرن اور ورن کے سرمایہ سے ڈاکٹر جی ایسے ورن سے بار بار گزرے ہیں، جس سے ان کی راہگو رزرتار اور مشکبار ہوگئی ہے۔

کیسا سونا لاگتا - بن پریتم کے گاؤں
سپنے میں ہو سامنا - پکڑوں اس کے پاؤں

کیسی چمپا لاگتی - من بگیا مہکائے
گوری کا مکھ چومنے - پون جھکورا آئے

سکھیاں مجھے پکارتیں - بیتی سندر رات
سپنے کیسے تیاگ دوں - پریتم کی سوغات

''ورن'' اور ''چرن'' تک پہنچنے کا یہ بڑا ہی کٹھن مگر کانت کرن تجربہ ہے، جو اپنی بقا میں باوصال اور انتہا میں لازوال ہے۔ یہاں اناری ساڑھیوں اور دریا کے تٹ پر جھومتی ہری جھاڑیوں سی پاکیزگی ہے۔ ملن منظروں کی دوشیزگی سے مخمور اور لمبی تاگھ کی تڑپ سے مجبور، دیوالی کے جلتے ہوئے دیوں کی گرمی اور برہالی منظروں میں اڑتے ہوئے پرندوں کے پروں کی نرمی کے مصداق، ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے اپنے دوہوں پر مختلف عنوان لگائے ہیں۔ مثلاً پالن ہار، سوہنا سائیں، کسوٹی، سندر دیس، روپ سروپ اور برہا گنی وغیرہ۔ مگر یہ سب عنوان ''مدھ مکتی'' محبتوں کی پہچان سے بعنوان ہیں۔ ڈاکٹر جی کی ان سب کشت کاریوں پر لکھنا محال بھی ہے اور کار بے مآل بھی کہ ڈاکٹر جی اپنے شعری کمال میں ہر اس خیال تک پہنچے ہوئے ہیں جہاں فنی جمال کی منزلیں شروع ہو کر اپنے حتمی وصال تک چلی جاتی ہیں جہاں تخلیق کار کے سینے سے لامتناہی اسرار کے کئی ایک مرغزار خزینے پھوٹتے ہیں اور انگ انگ میں کتنے ہی نگینے ٹوٹتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ موجودہ دوہا نگاروں میں ڈاکٹر جی کا نام سرفہرست ہے۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دوہا میں جتنا کام ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے التزام کیا ہے اس کے دوام تک کوئی دوسرا نہیں پہنچتا۔

ڈاکٹر خیال امروہوی

قنوطی دور کی جواں فکری

(قطعات)

بچکر نہ جا سکو گے زمانے کے قہر سے
لاوا پھٹے گا دیکھنا ہر ایک شہر سے
کہا جانے کس مقام پہ تریاق ہو نصیب
اب تک تو صرف زہر ہی پایا ہے دہر سے

O

ہر چند خوشگوار محبت کے پھول ہیں
روٹی نہ ہو تو سارے کرشمے فضول ہیں
رنگین کاغذوں کا ہیں لقمہ حسین جسم
بدکاریاں ہی آج سنہری اصول ہیں

O

تعلیم سے بھی کہنہ عقیدہ نہ مر سکا
تقلید کا بخار نہ سر سے اتر سکا
کانٹے بچھائے جہل خرد نے کچھ اس قدر
بے زخم کوئی راہ یہاں طے نہ کر سکا

O

وہ تعفن ہے کہ محسوس ہوا دم نکلا
اپنی تاثیر میں ہر لمحہ یہاں سم نکلا
نار دوزخ ہے مقدر میں تو مل جائے گی
زندگی میں تو ہر اک شہر جہنم نکلا

O

عمر بے رنگ عجب طور گذاری ہم نے
میلی پوشاک بدن سے نہ اتاری ہم نے
فکر کو بیچ کے کھائے نہ مرغن لقمے
زندگی جھوٹ سے ہرگز نہ سنواری ہم نے

O

ماحول کے معیار سے جینا نہیں آیا
ساغر تو کئی آئے تھے مینا نہیں آیا
ہر چند کمی آئی نہ میخانے میں لیکن
افسوس تو یہ ہے ہمیں پینا نہیں آیا

جانے وہ جذبہ گفتار کہاں جا نکلا
ایک بے نام سی مغموم فضا طاری ہے
اب تو جس لمحہ موجود نے گھیرا ہے ہمیں
یہ تو اک پوری صدی سے بھی کہیں بھاری ہے

O

دل سے تا ذہن کئی فاصلے آ جاتے ہیں
وسوسے جرات کردار کو کھا جاتے ہیں
پھر بھی کچھ ایسے ارادے ہیں جو تنہائی میں
شب کی وحشت کو چکا چوند بنا جاتے ہیں

O

کیا کہیں کیا نہ کہیں لفظ کہاں ملتے ہیں
کھوج ہی کم ہو تو کب گنج گراں ملتے ہیں
یوں تو ہم سوچ کی اس حد سے پرے جا نکلے
روح تخلیق کے آثار جہاں ملتے ہیں

O

اتنا مایوس نہ ہو تازہ سحر آئیگی
زندگی صورت خورشید نظر آئیگی
شاخ زیتون سے پھوٹیگی شگوفوں کی قطار
فاختہ ایک نئی لیکے خبر آئیگی
جسم ہر دور میں کوڑوں سے لہو رنگ ملے
ایسی تاریخ بھی کب روز نظر آئیگی

O

خیال خام ہوں یا خواب پی رہا ہوں میں
زوال عقل کے اسباب پی رہا ہوں میں
یہ میں ہوں یا ہے فقط وہم اپنے ہونے کا
یہ کیسی سوچ کا زہراب پی رہا ہوں میں
کبھی تو قطرۂ بحر آشنا میسر ہو
ابھی تو مے کے عوض آب پی رہا ہوں میں

سلمان سعید

وطن کے لئے ایک نظم

میں پھول بن کر
کھلوں تو کیسے
میں شمع بن کر
جلوں تو کیسے
کہ میرے ہر سُو
نظر نظر میں
عداوتیں ہیں!
مجھے مٹانے کی
سازشیں ہیں!!

دو جیون

تمہارے ساتھ
اذیت میں زندگی گذری
اور اس کے بعد
مصیبت میں زندگی گذری!

صامت وقار

دعا

اک محبت کرنے والا باپ بچوں کے لیے
جو بھی مانگے کم لگے
"یہ میرے لختِ دل روشن،
مری آنکھوں کے نور،
خانہ تاریک میں جھلمل چراغ
اے خدا!
سب دھڑکنیں میری بھی ان کی دھڑکنوں میں جمع کر
ہر بلا سے، بد دعا سے دے اماں،
ان کو ہریالی عطا کر، ہر خزاں سے دور رکھ،
کر انہیں خوش حال، مالا مال
حکمت سے، تدبر سے
مزین کر انہیں علم و عمل، فکر و نظر
عشق و وفا، تہذیب قلبی سے
بلندی کی طرف ان کا سفر آسان کر
اک پیر پرواز دے
زندگی کا ہر نیا انداز دے
ہر مصیبت ان کے حصے کی مرے دامن میں ڈال
احمدِ مرسل کے صدقے سب بلائیں ان کے سر سے ٹال۔
اک محبت کرنے والا باپ بچوں کے لیے
سوچتا ہے، جس طرح
سوچتا ہوں میں اسی انداز سے اس پاک دھرتی کے لیے
"اس کے دریا، وادیاں، کوہسار، بحر و بر،
یہ سارے کھیت، صحرا اور چمن
ہر تر و تازہ گلاب
کچے پکے گھر
زمین میں پیر مضبوطی سے گاڑے ہر شجر
ہر گل نورس، وفا کے سائے میں کھلتا ہوا
اے خدا سب کو سلامت رکھ
انہیں محفوظ رکھ ہر اک بلا سے بد دعا سے
ہر مصیبت ان کے سر پر آنے والی ٹال دے
خواہ میرے سب اثاثے چھین لے
زر بکف پھولوں میں جذبے سب مرے تقسیم کر
میری خوشیوں کی، مری دھرتی میں تو تجسیم کر
ایک دردِ دل مگر مجھ سے کبھی مت چھیننو
میں اسے بچوں میں اپنے منتقل کر جاؤں گا
کون کہتا ہے کہ اس کے بعد میں مرجاؤں گا
اے خدا! میری دعا پر داد دے۔"

پروفیسر زہیر کنجاہی

رسائی

یہ مانا
کہ تجھ تک رسائی نہیں ہے
مرے ہاتھ
تیرے گریباں، تری زلف شب گوں
ترے بام و در تک پہنچنے سے قاصر ہیں
قاصر رہیں گے
ترا نام ---
فیشن زدہ محفلوں میں
کلب اور اونچے محلات میں گونجتا ہے
مرے ہاتھ کی دسترس میں
فقط اپنا داماں
دریدہ گریباں
یا اپنے ہی معذور بھائی کے کمزور بازو ہیں
گردن ہے
اولاد کا جسم ہے
جن پہ چلتے ہوئے
میرے پاؤں کبھی لڑکھڑائے نہیں ہیں
ترے ہاتھ میں کنجیاں ہیں
سنہرے زمانے کا ہنستا ہوا 'پرس' ہے
مدارات
پھولوں کے گجرے ہیں
سرشار لب، 'کار' کوٹھی
اچھلتے، مچلتے ملازم ہیں، ماماؤں کی فوج ہے
یہ کوئی انوکھا تقابل نہیں ہے
مگر پھر بھی میں
اس تقابل کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر
سوچتا ہوں
کہ انسان کب تک سماجوں میں بٹتا رہے گا
سزاوار بکروں کی مانند کٹتا رہے گا

نورالصباح بیگم برلاس

وعدہ

کوئی وعدہ نہیں کرنا ہم سے
وعدے خوابوں کے دریچے بن کر
اک نئی دنیا میں لے جاتے ہیں
پھول کھلتے ہیں جہاں خواہش کے
روز امید جنم لیتی ہے
بے ثمر دھوپ میں جلتی شاخیں
ٹھنڈی چھاؤں میں بدل جاتی ہیں
ابر برساتا ہے خوشیاں سب پر
پیاس صحراؤں کی بجھ جاتی ہے
جس جگہ بھوک اگا کرتی تھی
لہلہاتی ہے وہاں شادابی
چہچہاتے ہیں پرندے ہر سو
امن کے گیت سب ہی گاتے ہیں
یونہی خوش فہمی میں چلتے چلتے
ہم بڑی دور نکل جاتے ہیں
آنکھ کھلتی ہے جو ٹھوکر کھا کر
خود کو وعدوں میں بندھا پاتے ہیں
پھر وہ ہی دھوپ میں وہ ہی بھوک وہ ہی تیرہ شبی
خواب تو خواب ہی رہ جاتے ہیں
کوئی وعدہ نہیں کرنا ہم سے
وعدے خوابوں کے دریچے بن کر
اک نئی دنیا میں لے جاتے ہیں

ساجد پال سنبہ

ماں

ماں تو ہر دور کی ماں ہے اسے رسوانہ کرو
آج پرشور جوانی تمہیں دھوکا دے گی
آج تم ماں کے تقدس کو نہیں سمجھو گے
آج تم بپھرے ہوئے شیر کی مانند کوئی
خون چاٹو گے تو تسکین جوانی ہوگی
لیکن اک موڑ پہ جب رات اندھیری ہوگی
کچھ تمہیں اپنی طرح بپھرے ہوئے لوگ نظر آئیں گے
ان کو دیکھو گے تو حد درجہ پشیماں ہو گے
مائیں تو شیر جنم دیتی ہیں عزت کے لیے
شیر وہ شیر ہے جو خونی درندہ نہ بنے
اپنے اندر کے شکاری کے نشانے سے بچے
اپنی اکڑی ہوئی گردن میں حیا کے موتی
اپنے ابھرے ہوئے سینے میں شرافت ٹانکے
ماں کسی دور کی ماں ہو اسے عظمت دے کر
اپنے ماحول میں رحمت کے ستارے بوئے
ماں کسی چاند کے ہالے سے دلہن لائے گی
جس کے دامن میں کسی ماں کی دعائیں ہوں گی
وہ دعائیں جو کسی شیر سے بیٹے کے لیے
ساری دنیائے محبت کا ''اثاثہ'' ہوں گی

خالد ریاض خالد

نئے منظر کی منتظر آنکھیں

خوف کی تتلیاں،
کالے پیرہن میں
چار سُو رقص کرتی ہیں
ابھی ہوا کی بولی 'سوگوار' ہے
اور سرخ آندھی شہر کی سرحد پہ!
ٹھہر گئی ہے
جب ہوا حاملہ ہوگی
تو بادل جنم لیں گے
پھر برف زدہ سوچیں
اور ساکت آنکھیں جاگ اٹھیں گی
پھر روشنی کا ایک ہالہ
مٹی کے تھال پہ پھیل جائے گا

محمد زبیر ٹیپو

انشائیہ

مچھر

مچھر کی پرواز اور واردات کا عمل سہل ممتنع معلوم ہوتا ہے۔ یہ انسان کا پالتو پرندہ نہیں۔ یہ قدرت کا پالتو پرندہ ہے۔ معلوم نہیں بغیر ادبی ذوق کے اس میں اتنی خودداری کہاں سے در آئی۔ ذرا سی حرکت بھی برداشت نہیں کرتا۔ اونٹ سے بھی زیادہ کینہ پرور ہے۔ اپنی دشمنی آنے والی نسل میں بھی منتقل کر دیتا ہے۔ غصے اور پیار سے بھی کام لیتا ہے لیکن انسان کو اس کی یہ کیفیت کبھی معلوم نہیں ہو سکی۔

ایسا ننھا سا پرندہ ہے کہ جس کی پرواز بازوں' شاہینوں سے بھی زیادہ تیز ہے۔ اپنے ہدف کو فوراً تلاش کر لیتا ہے۔ پھر اس کا دشمن پر پلٹنا جھپٹنا ایسا ہے کہ آن کی آن میں دشمن کے کاری ضرب لگاتا چلا جاتا ہے۔ نہ دشمن کے منہ سے ہائے وائے کی آواز نکلتی ہے۔ بلکہ الٹا مجلس میں بیٹھا غیر مہذب حرکات کرنے لگ جاتا ہے۔ اگر انسان اکیلا بھی کہیں بیٹھا ہوا ہو تو دیکھنے والا دوسرا آدمی اس کو پاگل ہی جاننے لگتا ہے۔

جانداروں میں واحد ایسا جاندار ہے جس کے کاٹنے سے آپ کو چودہ تکلیف دہ ٹیکے نہیں لگتے۔ بلکہ مزے دار خارش سے انسان جسم کی کھال کو کھردرا کر لیتا ہے۔ پھر ایک ہی وقت میں خارش جسم کے مختلف حصوں میں ہو سکتی ہے۔ اس کی کوئی سرحد اور حد نہیں۔ جہاں انسان موجود ہوتا ہے یا موجود ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ خوش بخت وہاں پہلے ہی تشریف فرما ہوتا ہے۔

اس سے حیوان ناطق ہی نہیں دوسرے حیوان بھی متاثر ہیں۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ کتے کو کاٹ جائے یا شیر کو کاٹ لے۔ تو یہ دونوں اپنے ٹانگوں کے پنجوں کی حرکات سے متاثرہ جسم کے حصے پر خارش کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں ایک ہی برادری کے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے پیدا ہونے والی خارش جنگل میں آگ کی طرح سارے جسم میں لگی محسوس ہوتی ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اتنے میں یہ صاحب جسم کے دوسرے حصے کو ہدف بناتے ہوئے چٹکی بھر کر غائب ہو جانا ان کی اولین صفت ہے۔

اتنا ہلکا پھلکا سا ہوتا ہے۔ اس کا وزن شاید ریت کے ذرے جتنا ہو۔ نہ ہی واردات پر نکلا ہوا نظر آتا ہے' نہ ہی بعد میں واردات والی جگہ کے قریب پایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کوا بڑا چالاک' مکار پرندہ ہے۔ انسان پتھر اٹھانے کا ارادہ کرتا ہے تو کوا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ خوش بخت مچھر ہے۔ کہ اس انداز سے جسم کا احاطہ کرتا ہے کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر لائٹ جلا کر دیکھتے ہیں تو دو تین ننھے منھے پرندے مچھر کے نظر آتے ہیں۔ ہم ان کو اس لیے نہیں مارتے کہ معلوم نہیں ان میں کسی نے ہمارے ساتھ گستاخی کی ہے۔ کوئی ناحق

ہمارے ہاتھوں سے شہید نہ ہو جائے۔ اور ہم مچھر مار مشہور ہو جائیں جو کہ اچھی شہرت نہیں۔

میرا اندازہ ہے مچھر کسی تہذیب اور ثقافت پر کسی اخلاق کا ذمہ دار نہیں۔ نہ کسی قسم کی حد اس پر عبور کرنا گناہ ہے۔ اس کی ذات میں نہ زبان کا تعصب ہے نہ مذہب۔ نہ امیر وغریب کی اس کے سامنے قدر ہے نہ علاقائی پابندی۔ کتوں کی طرح اور انسانوں کی مانند۔

بلکہ مجھے تو بعض دفعہ انسان معلوم ہوتا ہے کہ مچھروں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ پہلے ان خوش بختوں کو انسان کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ ان خوش بختوں کا قتل کرنے کے لئے جتنی مرضی خوشبو والی ادویات ایجاد کر لے نا کام ہو چکا ہے۔ اگر اس کی فوج کا ایک دستہ شہید بھی ہو جائے تو دوسرا دستہ بغیر اطلاع کیے آپ کے کمرے میں، کھیل کے میدانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

شادی کی تقریبات پر ہم لوگ ایک دوسرے کے سروں پر روپیہ رکھ کر اس کو خوب منڈلاتے ہیں۔ یہ میدانوں، پارکوں میں ہماری آمد پر سروں پر خوشی سے جھومتا ہے۔ ہمیں معلوم اس وقت ہوتا ہے جب ان کا کوئی شرارتی دوست ہمارے کان یا پاؤں پر چپکے چپکے دستک دیتا ہے۔ اور ہم اوپر نیچے تالیاں بجاتے رہ جاتے ہیں۔

وہ نشانی کے طور پر اپنی طرح ننھے منے نشانات ہمارے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی قریبی عزیزہ مکھی صاحبہ کے بارے میں سنا اور دیکھا ہے گندی کی نشان دہی کے سوا کچھ نہیں کرتی۔ نقصان کم سے کم کرتی ہے۔ لیکن یہ مچھر خوش بخت تمام جان داروں پر بھی مہربان نظر آتا ہے۔ اس کائنات کی سب سے زیادہ بے چین روح شاید اسی میں ڈالی گئی ہے۔ اس لیے شاید وہ سب کو اپنی طرح بے قرار رکھنا چاہتا ہے۔

انسان مچھر کو رات کے وقت معلوم ہوتا ہے جگنوؤں کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا۔

مجھے اس میں گھوڑے کی خوبیاں بھی نظر آتی ہیں گو کہ ہم اس پر سواری نہیں کر سکتے یعنی گھوڑا کھڑا کھڑا سو لیتا ہے۔ چوبیس گھنٹے کی مستقل سواری ہے۔ جب دل کیا اس پر سوار ہو کر یہ جا اور وہ جا۔ گاڑی خراب ہونے کی صورت میں تمام پروگرام خراب۔ آپ بھی حیران ہوں گے کہ گھوڑے کا مقابلہ مچھر سے محترم اگر آپ اس کے اڑ سکنے کی صلاحیت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو میں قصوروار آپ ہیں مچھر نہیں۔ دونوں کا کام ہوا سے باتیں کرنا ہے یعنی پرواز۔ پھر مچھر کی پرواز تو بغیر وقفہ کیے جاری رہتی ہے۔

انسان بھی کتنا عجیب ہے۔ مچھر کے کئی نام رکھے ہیں۔ اس سے بیماریاں پیدا ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ انسان جو اعمال خود ایک دوسرے کی سرکوبی کے لیے انجام دے رہا ہے۔ نفرتوں کے بیج اپنی نئی نسلوں میں منتقل کر رہا ہے۔ اور الزام مچھر پر۔

اس کا ایک ہی صدیوں سے روایتی ہتھیار ہے۔ جس کے مقابلے کے لیے انسان کوئی متبادل ہتھیار نہیں بنا سکا۔ اس کے ہتھیار کے آگے انسان کی سب دوائیں اور تدبیریں نا کام ہو چکی ہیں۔ لیکن انسان مایوس نہیں ہوا۔ یہ بھی انگریز آرمی کی طرح ایک قدم پیچھے چلا جاتا ہے۔ پھر آگے آ جاتا ہے۔ اس کی فوج میں کوئی میر صادق اور میر جعفر نہیں۔

مچھر کوئی ریا کار نہیں۔ اس کی تاریخ اور مستقبل بڑی قوموں کی طرح زندہ و پائندہ ہے۔ انسان کیا اس کائنات کی ہر زندہ مردہ چیز کے ساتھ اس کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ بھلا اتنی لمبی رفاقت اور دم پخت ہونے کی مشق کیسے چھوڑی جا سکتی ہے۔ اگر ہم وقتی طور پر اس سے زمین پر بکھر بھی جائیں گے تو معلوم ہوتا ہے یہ وہاں بھی پہنچ چکا ہوگا۔ جہاں جہاں انسان کے جانے کی اطلاع دنیا میں گردشیں کر رہی ہیں اس کی ذات میں کوئی خان، وڈیرہ، چوہدری نہیں نہ ہی کوئی اعلیٰ منصب پر فائز ہے۔ واسطہ پڑنے پر معلوم ہوگا سب برابر انداز فکر کے مالک ہیں۔

یہ خود کفیل قسم کا ننھا سا پرندہ ہے جو دوسرے پالتو جانوروں کی طرح ہماری سخاوتوں کا منتظر نہیں رہتا۔ بلکہ اپنی خوراک جلد تلاش کر لیتا ہے۔ انسان کے قریب رہتے ہوئے اس میں بھی انسانوں والی خوبیاں اور عادتیں پائی جاتی ہیں۔ کھانے پینے اور اشیاء کے ذائقے بھی تبدیل کرتا ہے۔ انسانوں کی طرح رہائش پذیر ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا تو رہائشی علاقہ بہت وسیع ہے۔ معلوم ہوتا ہے انسانی جسم اس کا بہترین بستر ہے۔ کیونکہ ننھا پرندہ ہے۔ بس اتنے سے فرق کے ساتھ کے انسان کا ننھا بچہ سوتے ہوئے پیشاب کر دیتا ہے جبکہ یہ خوش بخت چٹکی سے کام لیتا ہے۔ ننھے بچوں والی عادات بھی رکھتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اچھا وقت آنے پر مجھے بھول گئے ہو۔ مشکل وقت میں تو تنکے کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ بڑے ناشکرے ہو جی انسان۔ اس کو انسان کی انہی لاپرواہیوں اور بے حسیوں پر غصہ آتا ہے۔

دوسری خوبی اس میں یہ ہے کہ یہ خوشبو سے بھی اتنا ہی متاثر ہے جتنا بدبو سے۔ انسان کی طرح نہیں کہ پھولوں سے محبت اور کانٹوں سے نفرت۔

ڈاکٹر محمد اشرف کمال
شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، بھکر

برطانیہ سے اردو مجلّہ مخزن ۶

''مخزن ۶'' جناب مقصود الٰہی شیخ کا مرتب کردہ ایک ایسا خوبصورت ادبی مجلہ ہے جو کہ اپنے معیار اور ادبی وقار کے حوالے سے مخزن کی پہلی تمام اشاعتوں سے بڑھ کر ہے۔ خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ اپنی تخلیقات کے اعتبار سے یہ ایک بھرپور ادبی رسالہ ہے جو نہ صرف ادبی رسالہ بلکہ اسے ایک ادبی تحریک کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ رسالہ ۹ حصوں پر مشتمل ہے۔

مخزن ۶ کی ابتدا کہکشاں کے عنوان سے ہوتی ہے۔ جس میں اکبر حیدر آبادی کی حمد اور حسین مشیر علوی کی نعت طیبہ کی راہ میں شامل ہے۔ اس کے بعد اس رسالے کے اداریے میں اولیہ کے عنوان سے مخزن کے مرتب مقصود الٰہی شیخ نے ادبی رسالوں کی باقاعدگی سے اشاعت اور ان کے ادبی معیار کے حوالے سے گفت و شنید کی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ سنجیدہ ادبی حلقے اس بات کی داد دیتے ہیں کہ برطانیہ اور مغربی دنیا میں رہنے اور بس جانے والے اردو قلم کاروں کی ایک معقول تعداد گزشتہ پانچ سال سے اپنی تخلیقات ''مخزن'' کے ذریعے برصغیر پاک و ہند کے جانے مانے نقادوں کے سامنے رکھ کر ان کی تول، تجزیہ اور رائے لیتی رہی ہے۔ ہمیں پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں سے خوشگوار تعاون ملا جس کے لئے ہم شکر گزار ہیں۔

مخزن ۶ کا پہلا حصہ افکار و مسائل کے نام سے ہے۔ جس میں الٰہ آباد سے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون اردو کی (نئی؟) بستیاں (؟) اور اردو کا پھیلاؤ، آصف جیلانی کا اردو صحافت، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا ادب میں سائنسی، سماجیاتی، تہذیبی اور مابعد الطبیعیاتی سطحوں پر نئی تبدیلیوں کو قبول کار جحان اور حقانی القاسمی کا تصغیر نہ کہ تنقید شامل ہے۔ اس کے علاوہ بلیک برن (یو کے) سے الٰہی بخش اختر اعوان کا مضمون زبان و وسیلہ کے ساتھ ساتھ باعث تحریر بھی ہے۔ جس پر پشاور سے ڈاکٹر صابر کلوروی کا تاثر ہے۔

دوسرے حصہ میں امریکہ، انگلینڈ اور جرمنی میں مقیم آغا محمد سعید، افتخار نسیم، بانو ارشد، جتندر بلو، رضاء الجبار، سائیں سچا، شمسہ مسعود، صفیہ صدیقی، طلعت سلیم، عطیہ خان، ڈاکٹر عمران مشتاق، قیصر تمکین، محسنہ جیلانی، مقصود الٰہی شیخ، نجمہ عثمان، نعیمہ ضیاء الدین، نیر جہاں کے اٹھارہ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تاثر لکھنے والے نقادوں میں ہندوستان اور پاکستان سے ڈاکٹر امجد پرویز، ناصر احمد نصیر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر مولا بخش، شفیق احمد شفیق، قیصر نجفی، محمد احمد سبزواری، پروفیسر حامد سروش، ڈاکٹر محمود الرحمٰن، سید ظفر ہاشمی، گلزار جاوید، منشایاد، محمد حمید شاہد، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، ناصر عباس نیر، عذرا اصغر کے نام شامل ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کے افسانہ مقدر کے کردار بڑے مضبوط ہیں۔ انہوں نے کر دارنگاری پر خصوصی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ اس افسانہ میں گلو میاں، جی ماں جی،

رابعہ جیسے کردار ان کے فن افسانہ نگاری کی پختگی کی علامت ہیں۔ نعیمہ ضیاء الدین کا افسانہ ایک شبد کا جیون ایک ایسی ہندوستانی لڑکی کی کتھا ہے جس نے انگلینڈ جیسے ملک میں اپنی عزت و عفت کو صرف اپنے جیون ساتھی کے لیے محفوظ رکھا' جب اس کی شادی ایک ہندوستانی سے ہوئی تو اس نے اس کے بے داغ ماضی کو سوالیہ نشان بنا دیا۔ نیر جہاں کے دو افسانے سیامیز ٹوئینز اور دھنک سے تپتی ریت تک دیار غیر میں مقیم لڑکیوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسرا حصہ ترکی میں اردو کے عنوان سے ہے۔ ڈاکٹر احمد بختار اشرف نے اپنی تحریر میں انقرہ یونیورسٹی کے ترک نژاد اردو دان کا تعارف کرایا ہے۔ جن میں ڈاکٹر جلال سوئیدن' ڈاکٹر خاقان قیوم جو' ڈاکٹر سلمیٰ بنیلی اور ڈاکٹر نوریے بلک کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جلال سوئیدن کی تحریر اردو سے پکا عشق' ڈاکٹر خاقان قیوم جو کی اردو زبان و ادب سے لگن' ڈاکٹر سلمیٰ بنیلی کی پاکستان کی محبت میں اردو سیکھی' اور ڈاکٹر نوریے بلک کی میرا اوڑھنا بچھونا' اردو شامل ہیں۔ اسی حصہ میں ترک افسانہ نگار خدیجہ ائز چلیبی کے افسانہ ''خنداں'' کا اردو ترجمہ مسعود اختر شیخ نے پیش کیا ہے اور اس پر تاثر و تبصرہ مسعود اختر شیخ نے لکھا ہے۔

چوتھا حصہ شاعری پر مشتمل ہے۔ جس میں آغا محمد سعید' احمد فقیہہ' اکبر حیدر آبادی' پاکیزہ بیگ' حسن شکیل مظہری' حفیظ جوہر' خالد یوسف' سوہن راہی' شہزادہ قمر الدین مبشر' طلعت اشارت' عابد ودود' محمد سرور رجا' منور احمد کنڈے' نور جہاں نوری' نیر جہاں' یوسف قمر کی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ ان شعرا کے کلام پر پاکستان اور ہندوستان کے ممتاز اور نامور ناقدین ڈاکٹر علی کمیل قزلباش' علی محمد فرشی' ڈاکٹر محمد اشرف کمال' ڈاکٹر انعام الحق جاوید' کلیم حاذق' پروفیسر آفاق صدیقی' ف س اعجاز' شفیق احمد شفیق' ڈاکٹر انور سدید' جمال نقوی' پروفیسر ریاض مفتی' صابر ظفر' ڈاکٹر محمود الرحمان' حمایت علی شاعر' ڈاکٹر معصوم شرقی کے تاثرات بھی شائع کئے گئے ہیں۔

پانچواں حصہ طاق ابرو کے عنوان سے ایک سروے پر محیط ہے۔ اس سروے میں برطانیہ سے مصطفیٰ کریم' روبینہ حمید' ڈاکٹر عبدالقدیر بیگ' ڈاکٹر رضیہ اسماعیل' صبیحہ علوی' محمد میاں مالیگ تنویر اختر' عطیہ خان' محمد رشید شیخ' ساحر شیوی' پاکستان سے ڈاکٹر انعام الحق جاوید' عقیل عثمانی' جرمنی سے اسحاق ساجد' حیدر قریشی' کشمیر سے خورشید کاظمی' پروفیسر ظہور الدین' عرش صہبائی اور ہندوستان سے اوم پرکاش سونی' ظفر نسیمی' عمر انصاری' ہاشم الصالح' انیس رفیع' ڈاکٹر محمود شیخ' رفیعہ منظور الامین' ڈاکٹر نگار عظیم' ف س اعجاز' مشتاق انجم' ڈاکٹر عطا خورشید' عابد سہیل' رزاق افسر کے نام شامل ہیں۔

چھٹا حصہ عمرانیات کے عنوان سے ہے جس میں علی اقبال کا مضمون ''جنس' عمومی رویے'' ایک کہانی کے خلاف عدالت میں مقدمہ' ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مہدی علی صدیقی کا فیصلہ' استنبول سے ع واحد کا مضمون جنسی کجروی کے اسباب اور جنسی کجروی کے اسباب پر محمد منشا یاد کا تبصرہ اور تاثر شامل ہیں۔

ساتواں حصہ مراسلات پر مبنی ہے جس میں بھارت سے رزاق افسر (میسور)' پروفیسر حامد کاشمیری (سری نگر)' خورشید کاظمی (جموں)' اظہار اثر (پٹنہ)' انیس رفیع (پٹنہ)' عمر انصاری (بھوپال)' برطانیہ سے بانو ارشد (لندن)' جتندر بلو (لندن)' صفیہ

صدیقی (لندن)' ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان (بلیک برن)' پاکستان سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال (بھکر)' اعزاز احمد آذر (لاہور)' قیصر نجفی (کراچی)' ڈاکٹر علی کمیل قزلباش (کوئٹہ)' محمد احمد سبزواری (کراچی)' ترکی سے پروفیسر ڈاکٹر احمد بختیار اشرف (انقرہ)' دبئی سے نجم الحسن رضوی' کینیڈا سے جاوید دانش کے خطوط شامل ہیں۔

آٹھواں حصہ میں یادنگاری کے ضمن میں کراچی سے محمد احمد سبزواری کی تحریر اوائل بیسویں صدی میں برصغیر کے چند پہلوؤں کی جھلکیاں اور مسعود احمد برکاتی کا مضمون مولوی عبدالحق کی خطوط نگاری شامل کیے گئے ہیں۔ نواں اور آخری حصہ یورپ میں اردو سوچ کے نام سے شامل مجلہ کیا گیا ہے۔ جس میں سائیں سچا (سویڈن) کا مضمون اردو کی بقا اور یوکے سے ڈاکٹر عمران مشتاق کا مضمون بچوں کا اردو ادب مخزن ۶ اس رسالہ میں شامل ہیں۔

جناب مقصود الٰہی شیخ کی شبانہ روز کوششوں نے اسے ایک ادبی و تاریخی دستاویز بنا دیا ہے۔ ''مخزن ۶'' بلا مبالغہ ایک ایسے ادبی دھارے کا نام ہے۔ جس میں دنیا بھر کے اردو تخلیق کاروں کی تحریریں سمودی گئی ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ نے دنیا بھر سے اردو کے نمائندہ تخلیق کاروں' شاعروں' ادیبوں' محققین اور ناقدین کو ایک جریدے کی صورت اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کامیاب ادبی اور صحافتی کاوش پر وہ صحیح معنوں میں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اب اردو ادب کے شائقین کو مخزن ۷ کا بے تابی سے انتظار ہے۔

☆

ڈاکٹر کنول فیروز کے اعزاز میں تقریب

لاہور (ادبی رپورٹر) ہفتہ ۲۳ جون ۲۰۰۷ء کو معروف شاعر اور روزنامہ ''پاکستان'' لاہور کے کالم نویس ڈاکٹر کنول فیروز کے اعزاز میں نیشنل کونسل برائے انٹر فیتھ مکالمہ کے زیر اہتمام ماہنامہ ''سپوتنک'' کے ڈاکٹر کنول فیروز نمبر کے حوالے سے ایک خوبصورت تقریب ''ادبی بیٹھک'' الحمرا ہال۔۳ لاہور میں منعقد ہوئی جس کی صدارت شاہد حامد سابق گورنر پنجاب نے کی جبکہ مہمان خصوصی سید اصغر حسین گیلانی ایگزیکٹو ڈائریکٹر ''الحمرا'' آرٹس کونسل لاہور تھے۔ نظامت کے فرائض افتخار مجاز نے ادا کیے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں شاہد حامد سابق گورنر پنجاب، سید افضل حیدر سابق صوبائی وزیر قانون پنجاب + رکن اسلامی نظریاتی کونسل حکومت پاکستان، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر اعجاز انور ڈائریکٹر این سی اے، ابصار عبدالعلی، ڈائریکٹر پاکستان پریس انسٹی ٹیوٹ، حسین مجروح، سرفراز سید، خالد احمد، کرامت بخاری، پروفیسر مبارک حیدر، پروفیسر مظفر بخاری، نسرین انجم بھٹی، فوزیہ تبسم، آغا امیر حسین مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''سپوتنک'' لاہور، آفتاب جاوید اور ریورنڈ فادر فرانسس ندیم ایگزیکٹو سیکرٹری نیشنل کونسل برائے انٹر فیتھ مکالمہ نے ڈاکٹر کنول فیروز کی شخصیت اور فن کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی اور ان کی گراں قدر ادبی اور صحافتی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ''سپوتنک'' کی اٹھارہ سالہ صحافتی خدمات کو سراہا۔

اس موقع پر ڈاکٹر کنول فیروز نے احباب کی محبتوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنا کلام سنایا۔

اس دوران روزنامہ ''پاکستان'' کے کالم نویس رفیق غوری، جاوید صدیق بھٹی، جبیب بھٹی اور یوئیل بھٹی نے پھولوں کے گلدستے پیش کیے جبکہ ایم آر شاہد نے گورنر شاہد حامد اور ڈاکٹر کنول فیروز کو اپنی کتب تحائف میں پیش کیں۔ تقریب میں ادیبوں اور دانشوروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں قائم نقوی، ثناء اللہ شاہ، زبیدہ حیدر زیبی، ضیا اللہ رانا، طیب منصور، عرفان صادق، رضی حیدر، قاسم جلال، ملیحہ تنویر، حکیم سلیم اختر، ارشد چوہدری، زاہدہ راؤ، آستاتھ کنول، یونس کھوکھر، ابرار حامد، کوثر ایمن، شائلہ کنول، سلینہ علی، عامر وقاص چوہدری، عمانوئیل سرفراز ایگزیکٹو رکن پریس کلب لاہور، ریحان اظہر، محمد اسلام شاہ اور شاہد بخاری ایڈووکیٹ، منی بھائی یو ایس اے، عمانوئیل یوسف اور سموئیل پیارا شامل تھے۔

رپورٹ: ذیشان رانا

مرکزی سفینۂ ادب کی کل پاکستان محفل سخن

مرکزی سفینۂ ادب گوجرانوالہ کے زیر اہتمام سفینۂ ادب ہال میں گزشتہ جمعہ کی شب ایک بھرپور محفل سخن منعقد ہوئی جس میں ملک بھر سے مہمان شعراء نے شرکت کی۔ اس محفل مشاعرہ کی صدارت اسلام آباد سے آئے ہوئے خوبصورت جدید لہجے کے شاعر جناب پروفیسر اعتبار ساجد نے کی جبکہ مہمانان خصوصی میجر شہزاد نیر (کوئٹہ) صالح ولی آزاد (چترال)، ڈاکٹر ثاقب آکاش (گجرات)، آزادی حسین گجراتی (گجرات) تھے۔ مہمانان اعزاز میں اختر ڈار (علی پور چٹھہ)، عالمگیر خیالی (سمبڑیال)، شبیر شاہد (ڈسکہ)، شبیر بلو (ڈسکہ)، ارشد نور بھٹی (گجرات) اور فرخ طفیل (مریدکے) کے نام شامل ہیں۔ مشاعرے کی نظامت سفینۂ ادب کے روح رواں ممتاز شاعر ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے کی اور اپنے مخصوص انداز سے حاضرین مشاعرہ کو خوب محظوظ کیا۔ اس محفل مشاعرہ میں مہمانان کے علاوہ جن مقامی نمائندہ شعراء نے شرکت کی ان میں پروفیسر قاضی اعجاز محور، انصر علی انصر، عطاء اللہ جوہر، غلام زبیر نازش، حافظ محمد رمضان، افتخار امجد، عمران ہاشمی، طارق محمود، طارق محمود چمن، عمران اعظم رضا، حفیظ اللہ حفیظ، غلام عباس، شبیر تبسم، اعجاز حسین فانی، مرزا نعیم بیگ، غلام رسول ساقی، ڈاکٹر انوار احمد اعجاز، محمد عارف شاد، فیصل سعید، معظم علی معظم، مجید چوہدری، امجد بھٹی اور سیف اللہ زاہد کے نام قابل ذکر ہیں۔ محفل مشاعرہ کے اختتام پر تمام مہمان شعراء کو یادگاری شیلڈز دی گئیں اور پچھلے دنوں انتقال کر جانے والے معروف شاعر سید معرفت ہمدانی، ڈاکٹر انوار احمد اعجاز کے والد، باقی احمد پوری کی والدہ اور جاوید صدیق بھٹی کی خالہ کے انتقال پر دعائے خیر کی گئی۔ بعد ازاں مہمانوں کو تواضع کے بعد پرتپاک طریقے سے رخصت کیا گیا۔ مرکزی سفینۂ ادب کی یہ تقریب ایک یادگار محفل مشاعرہ تھی جو اپنے کلام کے معیار اور محفل کی خوبصورتی کی وجہ سے مدتوں یاد رہے گی۔

مرکزی سفینۂ ادب کے ماہانہ مشاعرہ میں راشد نور، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی شہزاد نیر، اعتبار ساجد، ڈاکٹر ثاقب آکاش کا گروپ

گوجرانوالہ:- سفینۂ ادب کے مشاعرہ میں حافظ رمضان، ماہر کرنالی غلام مصطفیٰ بسمل، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی حافظ اقبال

سفینۂ ادب اور جی ٹی وی کے مشاعرہ میں شریک شعراء کا گروپ فوٹو

پروفیسر احمد علی غوری، منیر صابری کنجاہی اور ڈاکٹر سعید اقبال سعدی ایک ادبی تقریب میں

رپورٹ: کاشف بٹ

قلم کارواں حویلیاں (ہزارہ) کے زیر اہتمام معروف شاعر ڈاکٹر محمد رفیق (مرحوم) کی یاد میں ایک شام

نامور شاعر جناب سلطان سکون نے صدارت کی اور مہمان خصوصی ارشاد ارائیں تھے۔

قلم کارواں حویلیاں (ہزارہ) کے سابق صدر، معروف شاعر جناب ڈاکٹر محمد رفیق (مرحوم) کی یاد میں گذشتہ دنوں بروز جمعۃ المبارک حویلیاں میں ایک شام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ملک کے نامور شاعر، بابائے ہند جناب سلطان سکون نے کی۔ مہمان خصوصی جناب ارشاد ارائیں تھے۔ یہ شام دو ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلے دور میں مرحوم کے فن و شخصیت پر مضامین پیش کئے گئے۔ جبکہ دوسرے دور میں شعرائے کرام نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ازہر بخاری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

قلم کارواں کے نومنتخب صدر جناب سعید صاحب نے تمام مہمانوں اور شعرائے کرام کو خوش آمدید کہا اور ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "حویلیاں کی تجارتی منڈی میں ادب کی داغ بیل ڈالنے میں جناب سعید ناز، جناب طالب انصاری اور ڈاکٹر محمد رفیق مرحوم کی خدمات کو سنہری حروف سے لکھا جائے گا، ہم ان احباب کی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔"

مہمان خصوصی جناب ارشاد ارائیں نے "قلم کارواں" کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے مرحوم کے فن اور شخصیت کو قابل تحسین وستائش قرار دیا اور یہ امید ظاہر کی کہ کاروان کی فروغ ادب کے لئے یہ سرگرمیاں مستقبل میں بہت سے قدر آور شعراء اور ادباء کے سامنے آنے کی نوید دیتی ہیں۔

صدر محفل جناب سلطان سکون نے اپنے مختصر خطاب میں مرحوم کی شخصیت اور فن کو سراہا اور "قلم کارواں" کی ادبی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا۔

مضمون نگاروں میں کاشف بٹ، عاصم شہزاد، نثار ناصر، پروفیسر ناصر داؤد اور مشتاق آثم کے نام شامل ہیں جبکہ محفل مشاعرہ میں جو احباب شریک ہوئے ان میں سید ازہر بخاری، سہیل شاہین، سعد اللہ سورج، ذاکر رحمٰن، محمد علی دائم، وجاہت علی وجاہت، نثار ناصر، عاصم شہزاد، عرفان تبسم، غفران الٰہی جامی، شیر دل، خان بشیر، راحیل شہزاد، کاشف بٹ، راشد رانا، پروفیسر ناصر داؤد، جاوید سائیں، معصوم شاہ معصوم، پروفیسر ابو کرام، طاہر گل، صغیر ندیم، سعید صاحب، احمد حسین مجاہد، ابرار سالک، ڈاکٹر دلدار احمد، خالد کولجہ، پروفیسر یحییٰ خالد، طالب انصاری، اجمل نذیر، ناصر بختیار اور صاحب صدارت جناب سلطان سکون شامل ہیں۔

☆

تاثرات

محترم جوش صاحب۔ آداب

لاہور سے وطن واپسی پر مصروفیت کچھ ایسی رہی آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ معذرت طلب ہوں۔

آپ کی باغ و بہار شخصیت اور مزاج کا کھلا پن بہت اچھا لگا۔ آپ کی دعوت بھی شاندار تھی۔ میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اتنا وقت' اتنی عزتی اور اتنی محبت عنایت کی۔ خدا آپ کو صحت مند اور خوش رکھیں' دعا گو ہوں۔

محبتوں میں یاد رکھیں۔ دعاؤں میں شامل رکھیں۔

بہت خلوص سے

ڈاکٹر کیول دھیر (لدھیانہ)

O

میرے پیارے اے جی جوش صاحب

السلام علیکم۔ جولائی کا ادب دوست اپنے خوبصورت ٹائٹل اور تغزل سے بھرپور آپ کی غزل کے ساتھ نظر نواز ہوا بلکہ دل نواز ہوا۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے اس دفعہ غزل کا حصہ قدرے کمزور ہے۔ آپ کی غزل نے لاج رکھ لی ہے۔ ان شعروں کی داد دینا چاہتا ہوں

اے عشق مجھے دیوانہ کر — مری چاہت کو افسانہ کر
میں شمع کی خاطر جل جاؤں — مجھے محفل میں پروانہ کر
کچھ دیر تو میری پیاس بجھے — اب شیشے کو پیمانہ کر
میری ہے خیر شب ہجراں — تو اپنا کوئی ٹھکانہ کر
کیا رکھا ہے اب شہر میں جوشؔ — آباد کوئی ویرانہ کر

انوار فیروز کا یہ شعر مجھے پسند آیا ہے

وہ پیڑ جس پہ کسی اژدہے کا ڈیرہ ہو — مجھے بتاؤ کہ اس پہ کہاں ثمر ٹھہرے

عرفانہ امر کے اس شعر کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا

بچا سکتے ہیں وہ کیسے کوئی دل ٹوٹ جانے سے — حقیقت کو بھی جو تعبیر کرتے ہیں فسانے سے

نظموں میں جناب نیاز احمد صوفی کی نظم دعوت پرواز بہت اچھی ہے۔ ان کی جوانی کے موسموں کی یاد دلاتی ہے جب وہ ایک

جہان رنگ و بو کو اپنے ساتھ اڑائے لئے پھرتے تھے۔ سلمان سعید، کرامت بخاری، طالب انصاری، صامت وقار، معصومہ شیرازی، نمیرہ امین سب کی نظمیں مجھے پسند آئی ہیں۔ اس دفعہ نظموں کا پلہ بھاری ہے۔ معصومہ شیرازی کی نظم میں جو رنگ اور آہنگ ہے وہ منیر نیازی کی یاد دلاتا ہے۔ طالب انصاری کا رنگ سخن مجید امجد کی یاد دلاتا ہے۔ کرامت بخاری نے گزرتے وقت کے جور و ستم کو خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے۔ ان کی نظم شب ہجراں بھی خوب ہے۔

نثری حصے میں صرف ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے ''جمیل یوسف کے ادبی مضامین''۔ تاثرات میں نیاز احمد صوفی کا خط دو تین دفعہ پڑھا ہے۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی۔

برادرم سعید اقبال سعدی سے گلہ ہے کہ انہوں نے محترمہ شمیم شاہ کا کوئی شعر نہیں دیا۔

والسلام، دعا گو، جمیل یوسف

O

بزرگ محترم، السلام علیکم

آپ اور ادب دست کے تمام کارکنوں کو مبارک ہو کہ ادب دوست کی باقاعدگی اور انفرادیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس بار ڈاکٹر عبدالکلام صدر مملکت ہندوستان کی شاعری کے ترجمے نے اس جریدے کو انفرادیت بخشی۔ ہندوستان یا اس کے سیاسی عمائدین سے نظریاتی اختلاف اپنی جگہ مگر شاعری سے تعصب نہیں برتا جا سکتا۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی شاعرانہ سوچ میں حسن اور بے ساختگی کے ساتھ ادب برائے سیاسی زندگی کا عکس بھی موجود ہے جو ان کا ایسا حق ہے جسے چھینا نہیں جا سکتا۔ خود انہی کے بقول:

ہر اک بشر کو عطا کی گئی ہے آزادی　　　نگاہ رب میں مساوی ہے نسل انسانی

اس بار ظفر اقبال کی حمدوں میں مجھے تازگی فکر محسوس ہوئی مگر ہو سکتا ہے کہ میرے محسوسات پر کسی حساس آدمی کو دوبارہ حرف زنی کی ضرورت پیش آ جائے کیونکہ ظفر اقبال کی دونوں حمدوں میں چند الفاظ اور ایک دو اشعار صنف نعت کے لیے غیر مانوس قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ریاض حسین چودھری کی نعت میں ان کی رفعت فکر، حسن خیال، انتخاب الفاظ اور دامن عقیدت کی وسعت غرض بے شمار خوبیاں موجود ہیں

شاہد، خلانورد بھی ہیں آسمان پر　　　ہر نقش پا ہے آج بھی روشن حضور کا

پرتو روہیلہ کی نعت کبھی کبھار میری نظر سے گزرتی ہے اور ہر بار ایک نیا تاثر چھوڑتی ہے۔ اس بار شاید انہوں نے محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے کی پیروی میں نعت کہی ہے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل　　　ابر کے کاندھوں پہ صبا لائی ہے گنگا جل

جبکہ پرتو روہیلہ نے اس خیال میں خوبصورت علامات کی مدد سے جدت پیدا کی ہے

بحر مردار سے اٹھتا نہیں کوئی بادل   مزرعِ فکر کہ برسوں سے پڑی ہے چٹیل

ایسا لگتا ہے یہ دنیا کوئی ویرانہ ہے   ریگ افشاں ہوں جہاں میں تن تنہا پاگل

پرتو روہیلہ کی یہ ناتمام کاوش فی الحال' قلب سنگیں کو صیقل کرنے کے لئے گنبد سبز سے پھوٹنے والی نور کی دھاروں کو وسیلہ بنانے کی دعا تک محدود ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر یہ مکمل ہوگئی تو یہ ان کا شاہکار ثابت ہوگی۔

میری عادت ہے کہ میں آپ کے جریدے میں پہلے حصہ غزل' پھر حصہ نظم پھر خطوط اور آخر میں مضامین اور حمد ونعت کا مطالعہ کرتا ہوں جس کے بعد جو تاثرات دل میں ابھرتے ہیں انہیں ان کی اہمیت کے مطابق ترتیب سے تحریر کرتا چلا جاتا ہوں۔ اس کی ظاہری سطح پر غزل کی سی بے ربطی ہے۔ جس پر غور کیا جائے تو ایک باطنی وحدت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔ شدت احساس جو شدت عشق سے جنم لیتا ہے وہ اس نظم کا مضوع ہے جبکہ نمیرہ امین اسی شدت احساس کے باعث تنہائی کی اذیت سے دو چار ہوتی ہیں اور اپنے قاری کو بہت کامیابی سے' شاعرانہ مہارت کے ساتھ اپنے شدت عشق کا احساس دلاتی ہیں۔ محترم طالب انصاری نے لاحاصل زندگی اور عمر کی رایئگانی کے لیے خالی چرخہ گھوم رہا ہے کی نہایت معنی خیز اور خوبصورت علامت استعمال کی ہے۔ ہم اسے ایک خاص عمر کی علامت بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب ناتوانی اور ضعف کے باعث انسان خود کو بے بس اور بقایا زندگی کو بے سود سمجھنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسی ناامیدی کے عالم میں' جس کا شکار آج قریب قریب ہر پاکستانی ہے' محترم طالب انصاری نے اپنے خط میں یہ لکھا کہ زندہ دلی پیٹ بھروں کا مشغلہ ہے۔ صوفیا کرام کے دور میں زندہ دلی کے ایک اور معنی بھی رائج تھے اور جس کی طرف میر درد جیسے قناعت پسند صوفی شاعر نے اشارہ کیا ہے

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے محترم نیاز احمد صوفی کی ''دعوت پرواز'' پڑھتے ہوئے اسی دنیا کی طرف سفر کرنے کا پیغام ملتا ہے جہاں ایک شوخ فضا افلاک تلے پھیلی ہوئی ہو اور جہاں

جب زلف کھلے تب ابر کھلے   جب پگھلے سونا شام ڈھلے

سینے میں عزم کا دیپ جلے   دل میں ہے یہی امنگ اڑو

محترم سلمان سعید کی نظموں میں سادگی اور ہمواری ہے جبکہ کرامت بخاری کی دونوں نظمیں بہت معنی خیز ہیں۔ ان کے ذہن میں شاید شیکسپیئر کا یہ جملہ بھی ہو کہ وقت اس کے حسن کے سامنے تھم گیا تھا اور شاید جدید نظریات بھی ہوں جن کے مطابق ایک خاص صورت حال میں وقت تھم جاتا ہے اور کرامت بخاری اسی دیس میں جانا چاہتے ہیں جہاں وقت ٹھہر کر خود انسان سے پوچھے کہ کب چلنا ہے کب رکنا ہے' یعنی وہی بات کہ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ ترنم ریاض کی نظم ''کہیں کوئی نہیں'' ہمیں ایک جھٹکے سے دو چار کرتی ہے اور ہم جہان عشق سے نکل کر تلخ حقائق کی موجودہ دنیا میں واپس آجاتے ہیں۔ سیما پیروز کے ماہیے بھی ہمیں اسی دنیا

کی تلخیاں محسوس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ حصہ غزل میں ہر شاعر نے ایک سے زائد اشعار ایسے کہے ہیں جو ان کی ندرت فکر اور ترقی کی طرف مائل صنف غزل کا ثبوت ہیں۔ ظفر اقبال' حسن عسکری' اسلم گورداسپوری' محمد امین' محمد عبداللہ جمال' انوار فیروز' حفیظ نوری' سہیل غازی پوری' اقبال سحر انبالوی' عاطف وحید یاسر' صدیق شاہد' سعید اقبال سعدی' جاوید صدیق' واجد امیر' مشتاق شبنم اور تصور اقبال کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں جبکہ سلمان سعید' عرفانہ امر اور اے۔جی جوش کی غزلوں کا رنگ ڈھنگ روایتی لگا مگر انہیں پڑھنے والا قاری بھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ حصہ غزل میں کچھ بڑے ناموں کی کمی بھی محسوس ہوئی مثلاً انور سدید' شہزاد احمد' مشکور حسین یاد اور وزیر آغا۔ ان میں انور سدید تو حصہ تنقید میں موجود ہیں مگر باقی احباب کسی جگہ بھی نظر نہیں آئے ہاں محترم شہزاد احمد ایک تصویر میں ضرور موجود تھے۔ حصہ تنقید میں حکیم سید محمود احمد سروسہارنپوری کا انداز تنقید بہت اچھا لگا۔ گو ان کا موضوع محترم جمیل یوسف کے ادبی مضامین تھے اور صاحب کتاب کی شخصیت اب متنازعہ سمجھی جاتی ہے مگر حکیم صاحب نے اپنے سنبھلے ہوئے انداز سے اس کتاب کے محاسن نمایاں کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ ماہ اگست' ماہ آزادی کے حوالے سے ایک نظم بھی خط کے ساتھ ملفوف ہے۔ اگر مناسب ہو تو شامل اشاعت کر لیجئے گا۔

فقط' صامت وقار

○

محترمی و مکرمی' تسلیمات!

خیریت موجودہ خیریت مطلوبہ صورت احوال یہ ہے کہ آج دیش کے جو حالات بنتے جا رہے ہیں ہمارے رہبر کرسی کے لئے جو گل کھلا رہے ہیں اس سے وطن کا کیا حال ہوگا یہ تو اوپر والا ہی جانے پر عوام نالاں اور پریشاں دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے مدنظر ایک تازہ غزل لے کر حاضر خدمت ہو رہا ہوں اگر کسی قابل ہو تو شامل اشاعت کر کے مشکور فرمائیں۔ گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔ سب سے آداب کہیے گا۔

خلوص آگیں' کرشن پرویز

○

محترم جناب اے جی جوش

السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ''ادب دوست'' کی مسلسل ترسیل کی رسید نہیں دے پا رہا۔ جس کے لئے معذرت --- مصروفیات کے باعث' یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

ایک مضمون بر عنوان ''ڈاکٹر خورشید رضوی۔ بحیثیت خاکہ نگار'' بھیج رہا ہے۔ شاید قابل اشاعت ہو۔

والسلام' مخلص' نسیم عباس احمر

O

پیارے جوش صاحب!

سلام خلوص! ادب دوست کی صورت میں آپ کی محبت مسلسل موصول ہو رہی ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم آپ کو اپنی رحمتوں سے نوازتا رہے۔ آمین۔ میں عرصہ دراز سے دل کے عارضہ میں مبتلا ہوں کئی ماہ تک ہسپتال میں داخل رہا وہاں پر بھی ''ادب دوست'' میرا ڈاکٹر بنا رہا۔ اب طبیعت بہتر ہوئی تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ادب دوست اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ گامزن سفر ہے سلمان پرویز صاحب کے فن سے اسے چار چاند لگ جاتے ہیں اور جناب محترم ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کی مکمل توجہ سے ''ادب دوست'' اپنا معیار بلند سے بلند تر کرتا جا رہا ہے۔ ادب دوست کی تمام ٹیم کو میرا اسلام۔ ''ماں'' کے عنوان پر اپنی نظم ارسال کر رہا ہوں۔ آس ہے کہ آپ کی محبت سے ادب دوست میں ضرور جگہ ملے گی۔

والسلام ساجد پال ساجد

O

مکرمی: آداب

مجھے 'ادب دوست' کا پتہ ڈاکٹر انور سدید صاحب کے مضمونہ مشمولہ 'الزبیر' سے ملا۔ اس سے پہلے شاید ایک شمارہ بھی کسی صاحب کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

میں گذشتہ ایک برس سے امریکہ سے ہجرت کرنے کے بعد کینیڈا میں اقامت پذیر ہوں۔ مجھے پراسٹیٹ کینسر کا موذی مرض لاحق ہے اور نہ معلوم کب بلاوا آ جائے۔ امریکا میں یونیورسٹی پروفیسر کے طور پر اپنی ملازمت چھوڑ چکا ہوں' اور اب (عارضی یا مستقل؟) طور پر یہیں مقیم ہوں۔ میرے حق میں دعا کریں کہ شفایاب ہو سکوں۔

اس مکتوب کے ساتھ دو نظمیں منسلک کر رہا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ ڈاک کی شرحیں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ اس لئے آپ اگر رسالہ بھیج سکیں تو مجھے خوشی ہوگی اور اگر نہ بھیج سکیں تو مجھے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ صرف یہ کرم کریں کہ ای میل سے اصفحے کو scan کر کے اس کی تصویر مجھے بھیج دیں۔ میری مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ میں زر سالانہ آپ کو بھیج سکوں۔

خدا آپ کو خوش رکھے۔ ای میل کا پتہ نوٹ فرمائیں۔ spanand786@hotmail.com

نیازمند: ستیہ پال آنند

O

محترم اے۔ جی جوش صاحب!

مزاج گرامی قدر آپ کا پرچہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت' دیدہ زیب اور موثر نظر آیا۔ حسن عسکری کاظمی' سہیل غازی پوری'

سعدی بھائی اور صامت وقار کی تحریریں اور تخلیقات ہمیشہ سب سے پہلے دیکھتا ہوں۔

تقریبات کا احوال اچھا ہے۔ تاثرات اور پنجاب رنگ بھی اچھا ہے۔ الیکشن کے حوالے سے آپ کی تحریر ''اداریہ'' بھی ایک اہم تحریر ہے۔ آپ کے پرچے کے لئے غزلیں حاضر ہیں۔

مخلص، کرامت بخاری

O

محترم اے جی جوش صاحب

سلام خلوص! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

''ادب دوست'' کی باقاعدہ اشاعت اور ۷۹ویں سالگرہ مبارک ہو۔ آپ ہم سے ۱۰ سال بڑے ہیں۔ اور بڑے ہی رہیں گے۔ آپ کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔ ادب دوست بتدریج ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ جون ۲۰۰۷ء کے شمارے میں غزلیات کی ترتیب میں غالباً کچھ ''ہیر پھیر'' ہو گیا ہے۔ ذوقی مظفر نگری استاد محترم حضرت احسان دانش کے گدی نشینوں میں سے ہیں اور بہت سینئر اور پختہ گو شاعر ہیں۔ ان کی غزل ان سے کہیں جونیئر شعراء کے بعد درج ہوئی ہے یقیناً یہ سہواً ہو گیا ہو گا۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔

فقط والسلام، بندۂ محبت

کنول فیروز

O

جناب اے جی جوش

آداب۔ امید کرتا ہوں آپ اچھے ہوں گے۔ ادب دوست کا شمارہ جولائی موصول ہوا۔ غزلوں میں ظفر اقبال، محمد امین، صدیق شاہد، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی، جاوید صدیق بھٹی، واجد امیر، اے جی جوش کی غزلیں قابل داد ہیں۔ خاص کر ظفر اقبال کی دونوں غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ طالب انصاری، معصومہ شیرازی اور نمیرہ امین کی نظمیں لاجواب ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون اچھا ہے۔

ایک نظم آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے (آمین)۔ احباب کے لیے سلام۔

نیاز مند، خالد ریاض خالد

ظفر اقبال

☆

اپنی لائی لوائی اگ
خورے کویں بجھائی اگ
کلیاں نہ کے سیکن لئی
اوس دے ہتھ منگائی اگ
سارا پنڈ بجھاوے پیا
ہو گئی دون سوائی اگ
ٹور پئی جد بوہتی بوہت
کلی پھوک نچائی اگ
ساتھوں اجے بلی وی نئیں
لین آ گئی تائی اگ
سڑ کے گھر ای سواہ ہویا
لا گئی اک ہمسائی اگ
نئیں سی ہور کوئی سربندھ
اگ دے وچ کھپائی اگ
لعبو بالے کڑیاں نے
گدھے وچ نچائی اگ
سانوں ساڑ گئی ظفرا
اپنی کدی پرائی اگ

☆

چیچو چیچ گنیریاں
تیریاں نہ میریاں
اجے ہور وی آونا
راتاں ات ہنیریاں
ککھاں دی مخلوق سی
تے، مٹی دیاں ڈھیریاں
ڈوبیاں چکن لئی اساں
جنہاں راہے گھیریاں
ہوئی بھن تروڑ کجھ
جھلن دیہو ہنیریاں
بنیاں اتے سپ سن
کنڈھیاں اتے بیریاں
کدی آپنی آس رہی
کدی اڈیکاں تیریاں
جاندے جاندے کر گئے
کندھاں ہور اچیریاں
سدھا ہو کے مڑ ظفر
چھڈ ایہہ ہیرا پھیریاں

افضال شاہد

☆

دوش کسے توں کیہ دینا اسیں آپ گئے آں لٹے
دل دے ٹوٹے کر کر ہتھیں راہواں دے وچ سٹے

پونی کتن دا ول ساتھوں علماں والیاں کھویا
بھرے ترنجن اجڑے ساڈے چرخے دی نیں لٹے

اڈھیاں چک چک قد ودھاون کوڑے لوک سودائی
عالم چنے بن بن پھردے بندے دو دو فٹے

فصلاں اپنے عملاں والیاں وڈن توں پے ڈردے
جس پیلی وچ کھکھڑی بیجی اوتھے تمیں پھٹے

انج تے ہر کوئی بننا چاہوے ورق سونے چاندی دا
کیہڑا پیڑ سہارے اپنی' اپنے آپ نوں کٹے

سائیاں تیرا شکر گذارے' شاہد لکھ لکھ واری
تیرے نام دی گدڑی پائی' درد غماں توں چھٹے

اج دا رانجھا اج دی ہیر

تکیا نئیں کوئی رانجھا نہ کوئی ہیر سامنے آئی اے
ایس زمانے دے وچ جیہڑا ملیا اوہ ہرجائی اے
اک دوجے تے مرن دیاں قسماں تے سارے کھاندے نیں
کوئی کسے تے کدی نئیں مردا ایہہ ساری چترائی اے
کھیڑے دے ویہڑے جا کے ہیر میں اپنی کیوں لبھاں
بھیس وٹا کے بن جاں جوگی عشق دی ایہہ رسوائی اے
عشق دیاں چھلاں دے اتے کچا گھڑا نئیں تر سکدا
اج دیاں سوہنیاں پچھدیاں نیں پئی ایہہ کیہڑی دانائی اے
وارث شاہ دی ہیر تے ڈولی چڑھدیاں چیکاں ماردی سی
اج دی ہیر نے جوش سے دے کیدو نوں نتھ پائی اے

صوفیہ بیدار

رخصتی

ملا' موت' میت تے منجھی
کلمے والی چادر......
چار کہار تے ڈولی چکن والے لکھ ہزار
ناں جاناں میں کوئی گواہی
ناں سجن ناں بیلی......
غیراں دے ہتھ میت میری
ہجر دی ریت اوتی
جیندے جی ناں ٹھنڈا اچھا
مریاں موت سوتی

اختر خیال

گیت

چرخہ میتھوں کتیا نہ جائے
پل پل ماہی دی یاد ستائے

دل دا بوہا میں نہ بھیڑاں
دکھ دی گل نہ چن نال چھیڑاں
ویری بن گئے آپنے پرائے
چرخہ میتھوں کتیا نہ جائے

جندڑی میری دکھاں دی ماری
ڈگ پئی میری کچی ڈھاری
اکھیاں چپ چپ اتھرو وگائے
چرخہ میتھوں کتیا نہ جائے

دل دا شیشہ میرا ٹٹیا
مار کے ماہی دھپے سٹیا
رب نہ بھیڑے دن دکھائے
چرخہ میتھوں کتیا نہ جائے

گیت

چن چندرے نال اکھ میری لڑ گئی
پیار دی چنی میری رہی نال اڑ گئی

دل دا حال نہ چن نوں دسدی
پھنی بن کے چن نوں نہ ڈسدی
ویکھ کے سننا چن دا ڈر گئی
چن چندرے نال اکھ میری لڑ گئی

پینگ میری چڑھدی ادھ اسمانے
دل دا بھیت نہ میرا کوئی جانے
پیار دے پتن ڈب ڈب تر گئی
چند چندرے نال اکھ میری لڑ گئی

پل پل چن دی یاد ستاوے
چن دا سفنا میتوں نہ آوے
پیار دی اگ میں لا کے سڑ گئی
چن چندرے نال اکھ میری لڑ گئی

اختر خیال

ماہیے

(۱)

کوئی پیلوں پکیاں نے
ٹور کے چن ماہی
اکھاں رور دھکیاں نے

(۲)

مندری دانگ ماہیا
کوئی بجھائے نہ
لگی ہجر دی اگ ماہیا

(۳)

چہاں دے بیلے نے
جتھے سوہنی ڈب موئی
اوتھے لگدے میلے نے

(۴)

میری میلی چادرائے
پانی میں کنج بھردی
میری ٹٹ گئی گاگرائے

(۵)

دیوے دی لوماہیا
پیار جے کیتا ای
ہن کیہتے تے روماہیا

(٦)

لیرا تن دادھوتا اے
جنوں میں اڈیکدی ساں
اک پل نہ کھلوتا اے

(۷)

چچی پایا چھلا اے
اور کھ سڑ جاندا
جبڑا بیلے وچ کلا اے

(۸)

کوئی بوٹا دھریکاں دا
پیار میں نج پاندی
پتہ ہندا جے لیکھاں دا

"قلم کارواں" حویلیاں کے زیر اہتمام
ڈاکٹر محمد رفیق مرحوم کی یاد میں منائی
گئی ایک شام کی تصویری جھلکیاں

صاحبِ صدر "بابائے ہندکو"
سلطان سکون محو کلام ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیقؒ (مرحوم) کی یاد میں
ایک شام "قلم کارواں"
طالب انصاری محو کلام ہیں۔

حاضرین وسامعین

کی دلچسپی کا ایک انداز

Monthly **ADAB-DOST** LAHORE

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۱۷

اگست ۲۰۰۷ء

معروف شاعر

اے۔جی جوش کے شعری مجموعے